سیرۃ نبوی اور مستشرقین

سلسلۂ مطبوعات اردو اکاڈمی نمبر ۱۷

سیرت نبوی اور مستشرقین

مرتبہ

مولوی عبدالعلیم احراری بی اے آنرز (جامعہ)

سنہ ۱۹۳۰ء

در مطبع معارف اعظم گڈھ

سلسلہ مطبوعات اُردو اکادمی
نمبر ۱۶

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

یعنی

مشہور مستشرق ولہا وزن کے مضمون کا اُردو ترجمہ

مع

حواشی و مقدمہ

از

(مولوی عبدالعلیم احراری بی اے آنرز (جامعہ)

۱۹۲۹ء

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
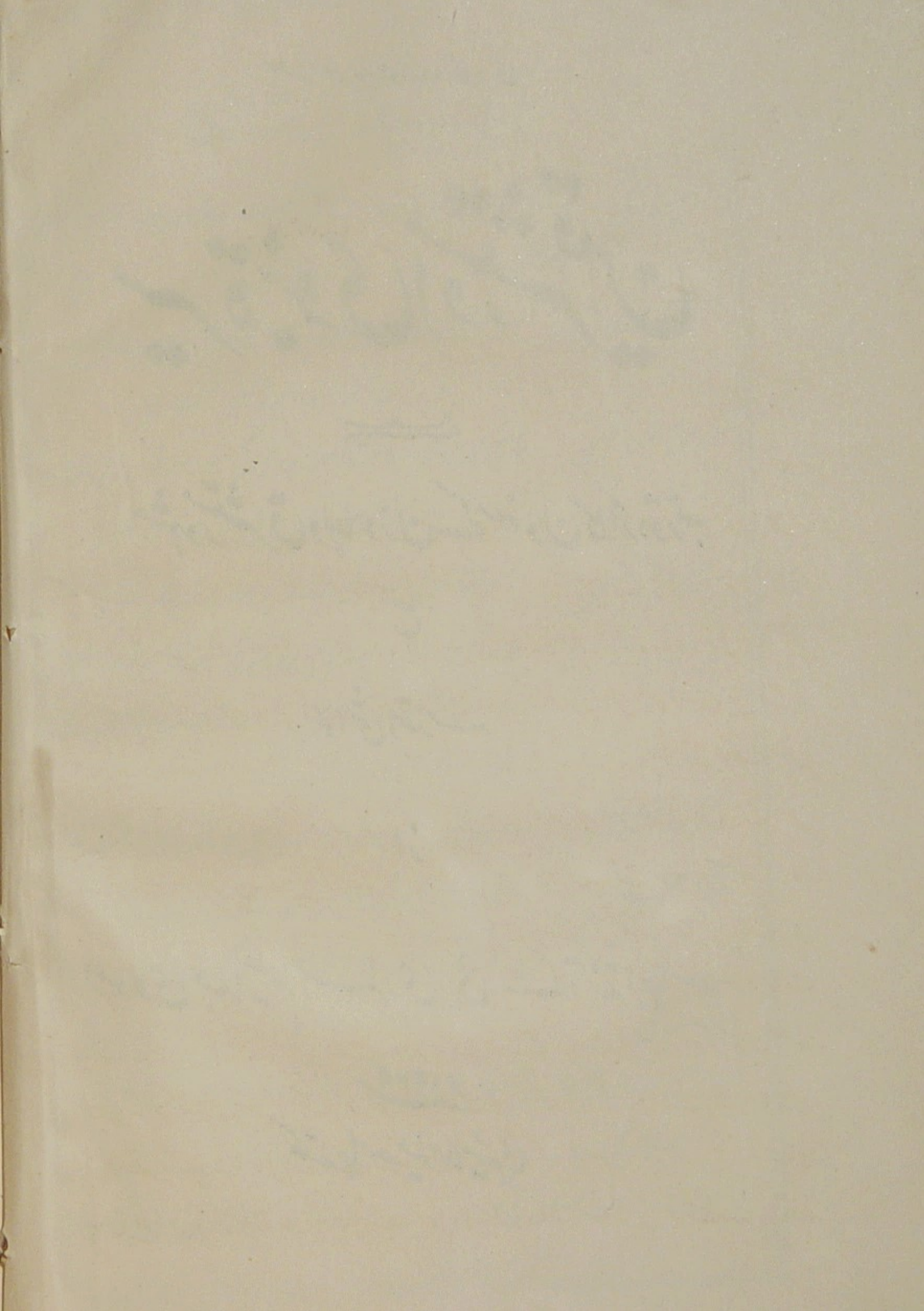
سیرتِ نبوی اور مستشرقین

مقدمہ

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ کتاب جسکا یہ مقدمہ ہے مشہور مستشرق ولہاوزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی طبع نہم میں محمدؐ ازم کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس مضمون میں سے بھی صرف اس حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلعم سے متعلق ہے۔ مستشرقین نے اسلام اور ہادی اسلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اردو داں طبقہ اور خصوصًا علمائے کرام بہت کم واقف ہیں۔ یہ زہر انگریزی کے ذریعہ سے جدید تعلیمیافتہ جماعت میں پھیلتا جاتا ہے اور جن لوگوں پر دینی ہدایت کی ذمہ داری ہے ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کے صحیح خیالات سے اور انکی حقیقت سے لوگ واقف ہو جائیں تاکہ ایک طرف تو علماء کو مسئلے کی اہمیت کا احساس ہو اور دوسری طرف جو لوگ اس قسم کے مضامین پڑھتے ہیں انہیں حقیقت حال کا علم ہو جائے۔ بعض حضرات کا ممکن ہے یہ خیال ہو کہ مستشرقین کے اعتراضات ابتک اردو داں طبقہ تک نہیں پہنچے ہیں اور ان اعتراضات کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اسمیں تو شک نہیں کہ ابتک اس قسم کے خیالات کا مرکز صرف انگریزی داں طبقہ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید ماحول کے اثر سے یہ زہر تجاوز کر کے نیم انگریزی داں طبقہ تک پہنچ گیا ہے اور یہاں پہنچکر اس کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ وہ اعتراضات کی حقیقت سے واقف

نہیں ہوتے بلکہ سنی سنائی باتوں سے انکی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرے اگر شاذو نادر کبھی انگریزی میں ان اعتراضات کے رد کرنیکی کوشش بھی کیجاتی ہے تو یہ لوگ اس سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے اور خصوصاً علمائے کرام کے لئے جن میں سے بیشتر السنہ مغربیہ سے نابلد ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اردو زبان میں پہلے ان اعتراضات کو صحیح طور پر بلا کسی مبالغے کے پیش کیا جائے اور پھر انکی حقیقت بے نقاب کیجائے اس طرح ممکن ہے ہمارے علما محسوس کریں کہ وقت کی ضرورت اب کیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ طہارت کے طویل الذیل مسائل اور آمین و رفع یدین پر مناظرہ، دینی خدمت تسلیم کیا جائے بلکہ آجکل تو اصول اسلام اور خود شارع اسلام پر ہر طرف سے اعتراضات کی بارش ہو رہی ہے اور اہل نظر کا فرض اور شدید ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کے سامنے پھر اسی رنگ میں پیش کریں جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے اور حواشی میں اعتراضات کا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مترجم کو اپنی خامیوں کا کامل احساس ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جواب کا پورا حق ادا نہ ہو سکا لیکن اسکا یہ مقصد بھی نہ تھا کہ ہر مسئلے پر آخری فیصلہ صادر کر دے۔ اس تالیف کی غرض تو یہ تھی کہ اعتراضات بہ تمام و کمال سامنے آجائیں اور جو لوگ جواب دینے کے اہل ہیں لیکن خواب غفلت میں یا کسی غیر ضروری کام میں پڑے ہوئے ہیں ذرا چونکیں۔ اگر یہ تالیف علماء کرام کے جمود کو توڑ سکے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جن کے قلوب تشکیک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں غور و فکر کے لئے کچھ مسالہ فراہم کر سکے تو اسکا مقصد حاصل ہو گیا۔ ولہاوزن کے اس مضمون کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس نے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کر دیا ہے جو مستشرقین عام طور پر سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ کے بعد شاید ہی کوئی اعتراض چھوٹ جائے۔ ایسا مضمون کوئی اور نظر سے نہیں گذرا جس میں مستشرقین کے تمام نظریات بیک وقت موجود ہوں۔ انکے خیالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ ولہاوزن کا شمار مستشرقین کے طبقہ اولیٰ میں ہوتا ہے

اور اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے یورپ کے اہل علم بہت مستند اور قابل وثوق سمجھتے ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے لئے خاص طور پر اس سے یہ مضمون لکھوایا گیا تھا اور غالباً جرمن سے ترجمہ کرا کے اس میں شائع کیا گیا۔

مستشرقین کے اعتراضات سے بحث کرنے سے پہلے اگر ہم ایک سرسری نظر ان خیالات پر ڈالیں جو اہل یورپ کے رسول اللہ صلعم سے متعلق ابتدائے اسلام سے لیکر عہد حاضر تک رہے ہیں تو ہمیں اسکا اندازہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ انکے خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ لوگ رسول اللہ صلعم کی ذات اور اصول اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب "محمڈ اینڈ محمڈنزم" میں جو پہلی دفعہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی ایک خاکہ اس وقت تک کے خیالات کا کھینچا ہے۔ اسکا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے (لفظی ترجمہ طوالت کے خیال سے نہیں کیا گیا) اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا "اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں دنیائے عیسائیت کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ تنقید یا توضیح کر سکتی اس کا کام تو صرف لرزنا اور اطاعت کرنا تھا لیکن جب وسط فرانس میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا قدم رکا تو ان قوموں نے جو بھاگ رہی تھیں مڑ کر دیکھا۔ اب بھی اگرچہ انکی ہمت جنگ کرنیکی نہ تھی لیکن وہ پیچھے ہٹنے والے دشمن کو گالیاں تو دے سکتی تھیں ٹرین کے رومان میں محمد (صلعم) کو جو بت پرستی کے شدید ترین مخالف تھے، خود ایک سونے کا بت کہا گیا ہے جس کی پرستش کاڈز میں ہوتی تھی اور جس کا نام مامٹ تھا رولان کے گیت میں جو فرانس کا قومی رزمیہ گیت ہے دکھایا گیا ہے کہ قرطبہ کا خلیفہ مارشل اسی بت کی پرستش کرتا ہے اور اس کی مرغوب قسم یہ ہے "عطارد کی قسم، محمد (صلعم) کی قسم اور اپولو کی قسم[1]"۔ عجیب قلب ماہیت اور عجیب افترا! اس بت کے سامنے انسانی قربانیاں کیجاتی ہیں اگر اور کہیں نہیں تو کم از کم دسویں

---

[1] رولان کے گیت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ جامعہ جلد نمبر ۹ جس میں یوسف حسین خانصاحب کا ایک سلسلہ مضامین "عرب فرانسیسی ادبیات میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

اور گیارہویں صدی کے مصنفین کے تخیل ہی میں سہی اور اسکا نام کبھی باقوم ہوتا ہے اور کبھی ماہومٹ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں ابتک عام غلط فہمی کی حامل ہیں فرانسیسی میں لفظ Mahometrie اور انگریزی میں Mummery ابتک لغو اور مہمل رسوم کے لئے استعمال ہوتا ہے بارہویں صدی میں بجائے معبود کے محمد (صلعم) کو ایک مرتد اور بے دین کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے دانتے نے انہیں جہنم کے نویں حلقے میں ان لوگوں کے ساتھ رکھا ہے جو مذہبی تفرقے کے بانی ہیں۔ بانیاں اصلاح (Reformation) نے بھی محمد (صلعم) کی طرف جو سب سے بڑے مصلح تھے کوئی توجہ نہ کی اور انکی نفرت بھی انکے علم کی مقدار کے ساتھ ساتھ قائم رہی مصلحین غالباً یہ نہ سمجھے تھے کہ پاپائی جماعت دونوں کو عیسائیت کا دشمن ٹھرائے گی اس لئے کہ پادریت اور رسوم پرستی کی مخالفت میں اسلام اور پروٹسٹنٹزم دونوں مشترک ہیں۔ اسی زمانے میں یہ حکایت بھی ایجاد ہوئی کہ ایک کبوتر کو محمد (صلعم) نے سکھایا تھا کہ انکے کان میں سے دانے چنے اس سے موجدین کے خبث سے زیادہ ان کی حماقت کا ثبوت ملتا ہے مگر یہ روایت بھی عام طور پر صحیح تسلیم کیجاتی تھی۔ اس وقت بھی حالت کچھ بہتر نہیں ہوئی جب یہ محسوس کیا گیا کہ رائے قائم کرنے سے قبل جہانتک ممکن ہو سرچشمے کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فرانسیسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۶۴۷ء میں اور دوسرا ۱۶۹۰ء میں ہوا اسی کے بعد ایک شخص الگزنڈر راس نے فرانسیسی سے انگریزی میں اسکا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ساتھ جو مقدمے درج تھے ان میں طرح طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے اس کا بھی کوئی اچھا اثر نہ پڑا پھر بھی باوجود ان غلط فہمیوں کے جو ابتک عوام میں رائج ہیں انگلستان اور فرانس ہی کے سر عربی ادب اور عربی تاریخ کو تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنیکی ابتدا کا سہرا ہے اور اسی ابتدا کی وجہ سے گبن اور میور، کاسین دی پرسیوال اور سینٹ ہیر، وائل اور اشپرنگر کے ہاتھوں اب ایسا مسالہ فراہم ہو گیا ہے کہ ہر شخص معقول اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس تحریک کا بانی گیگنیر ہے جو پیدائش کے لحاظ سے تو فرانسیسی تھا لیکن انگلستان کو اس نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر ہونے کے بعد اس نے محمد (صلعم) کی تاریخ لکھنی شروع کی جس کی

نیا د ابو الفدا کی تصنیف پر تھی ۔ اسکے بعد ہی سیل اور سیوارے نے دو مختلف یورپی زبانوں میں
قرآن کا ترجمہ کیا ۔ انہی تصانیف سے اور خصوصاً سیل کے "تمہیدی مباحث" سے گبن کو جو خود
عربی نہ جانتا تھا وہ مسالہ ملا جس سے اس نے وہ باب محمد کی زندگی پر باندھا جس کا جواب سیرت
نگاری میں نہیں ملتا ۔ لیکن انگریزوں کے خیالات میں جو کچھ بھی تبدیلی ہوئی وہ گبن کی وجہ سے نہیں
بلکہ کارلائل کی وجہ سے ۔ ہم میں سے کتنے اس تعجب انگیز اور علمی و مذہبی زندگی کے اس یادگار
واقعے کو بھول سکتے ہیں کہ کارلائل نے "ہیرو بصورت رسول" کے لئے نہ موسیٰ کا انتخاب کیا نہ
ایلیا کیا اور نہ عیسیٰ کا بلکہ محمد (صلعم) کو لیا جنہیں عام طور پر لوگ فریبی سمجھتے تھے ۔"

یہ تھا باسورتھ اسمتھ کی تحریر کا خلاصہ جس سے اس زمانے تک کے خیالات کا ایک دھندلا سا
خاکہ دماغ میں قائم ہو سکتا ہے اس میں بہت سے خیالات ایسے ہیں جنہیں نقل کرتے وقت ایک
مسلمان کا قلم کانپ اٹھتا ہے مگر تسکین اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" اس کے
بعد مستشرقین کا دور شروع ہوتا ہے جن کا ایک نمائندہ ہمارا مضمون نگار وِلہاؤزن ہے اور جس کے
خیالات اگلے صفحات میں مرقوم ہیں ۔ مستشرقین نے بھی باوجود کوشش کے رسول صلعم کی شخصیت
اور انکی تعلیمات کو کماحقہ نہیں سمجھا ، یا اگر سمجھا تو اسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے ہیں ۔ اس مقدمہ
میں بعض ان اصولی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کے سمجھنے کے بعد اعتراضات کی حقیقت کھلجائیگی
اور جنہیں یا تو مستشرقین سمجھے نہیں ہیں یا دیدہ و دانستہ ان سے چشم پوشی کرتے ہیں ۔

سب سے پہلا مسئلہ وحی کا ہے ۔ مستشرقین اسے تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلعم حامل وحی
خداوندی تھے اور خود رسول اللہ صلعم نے صاحب وحی ہونیکا جو دعوےٰ کیا ہے اس کی طرح طرح
سے تاویل کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ سراسر فریب ہے اور انہیں خود بھی یہ یقین نہ تھا کہ ان پر
نزول وحی ہوتا ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ انہیں صرع کی قسم کا ایک دماغی دورہ ہوتا تھا اور اس
دورے کی حالت میں جو خیالات انکے ذہن میں آتے تھے انہی کو وہ منزل من اللہ سمجھ لیتے تھے ۔
پھر ان میں بھی دو طبقے ہیں ایک کا خیال ہے کہ وہ آخری وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا رہے

اور دوسرا کہتا ہے کہ مکی زندگی میں تو واقعی انہیں اپنی نبوت کا خود یقین تھا لیکن مدینہ پہنچکر وہ صرف اپنی کامیابی کے لئے ایسا ظاہر کرتے تھے دراصل اب یقین انہیں بھی نہ تھا کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر تمام علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا اس لئے کہ وہ تو اُمی تھے۔ اس کے جواب میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی گئی ہیں جن میں سے اکثر حد درجہ مضحکہ خیز ہیں۔ اسی سوال کے جواب کے لئے بحیرا راہب کے قصے کو اسقدر شہرت دی گئی اور ذراسی بات کو ایک افسانہ بناکر پیش کیا گیا۔ اسکے علاوہ جیسا خود ولہاوزن نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا کہ یہودیوں سے شروع شروع میں رسول اللہ صلعم کے تعلقات اچھے تھے اور انہیں یہ سب علم انہی سے حاصل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اسلام کے نام سے من چلوں نے ضخیم رسالے لکھ ڈالے اور یہ کس لئے محض اس نظریہ کے ثبوت کے لئے کہ رسول اللہ صاحب وحی نہیں تھے حالانکہ کوئی قطعی ثبوت اب تک یہ لوگ پیش نہ کرسکے۔ محض یہ ثابت کردینے سے کہ اسلام کا فلاں رکن فلاں مذہب سے ماخوذ ہے یا اس کے مطابق ہے وحی کا انکار لازم نہیں آتا اس لئے کہ اسلام نے کبھی جدت کا دعوی نہیں کیا قرآن تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اسلام تمام انبیاء کا مذہب ہے یہ وہی اصل الاصول ہے جسے تمام مذاہب نے اپنا سنگ بنیاد قرار دیا ہے البتہ زمانے کے لحاظ سے ہر مذہب کچھ اپنی خصوصیات رکھتا ہے اور اسی وجہ سے فروعات میں تمام مذاہب مختلف ہیں۔ ثابت تو یہ کرنا چاہئے کہ رسول اللہ صلعم نے جس دین کی تبلیغ کی اسے انہوں نے کسی انسانی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور اسی کو مستشرقین باوجود کوشش کے ثابت نہ کرسکے۔ انہوں نے دوراز کار قیاسات اور غلط استنباطات کو تحقیق علمی کی صورت میں پیش کیا حالانکہ اہل نظر پر انکی مضحکہ انگیزی بالکل عیاں ہے۔

رسول اللہ صلعم کے صاحب وحی ہونے سے جو لوگ انکار کرتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو عیسائی مشنری یا دوسرے مذاہب کے مبلغین ہیں جو اپنے نبی یا پیغمبر کو تو صاحب وحی سمجھتے ہیں مگر رسول اللہ صلعم سے متعلق اسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ انکے لئے تو تمام دلائل بیکار ہیں اس لئے کہ ان کی رائے کا انحصار دلائل پر نہیں بلکہ جذبات پر ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ دوسرا

طبقہ وہ ہے جو وحی کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسکے لئے تمام انبیاء اور تمام مذاہب یکساں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ دلائل کی ضرورت اس طبقہ کے لئے ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وحی کا مسئلہ مابعد الطبیعات کے تمام مسائل کی طرح ظنی ہے۔ اس کے ثبوت میں کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں پیش کیجا سکتی جیسی طبعی علوم سے متعلق کہ مخالف کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ طبعی علوم میں بھی چند ہی ایسے مسئلے ہونگے جنہیں بلا استثنا تمام علماء تسلیم کرتے ہوں اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نزول وحی کو اس طرح ثابت کر دیا جائے جس طرح ریاضی کا یہ مسئلہ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ منکرین وحی کے پاس انکار کی کوئی وجہ بجز اس کے نہیں کہ سائنس یا عقل کی روسے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس استدلال کی کمزوری نمایاں ہو جاتی ہے۔ علوم و فنون میں آئے دن جو ترقی اور نظریات میں جو تغیر و تبدل ہو رہا ہے اس سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہوتی جاتی ہے کہ عقل انسانی نہایت درجہ ناقص ہے اور انسانی معلومات یکسر محدود ہیں۔ ہر روز ایک نہ ایک چیز ایسی دریافت ہوتی رہتی ہے جس سے نظریات کی پرانی دیوار مسمار ہو جاتی ہے اور نئی دیوار تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی ذی فہم انسان کسی نظریے کی بابت یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قطعی ہے اور نہ یہ کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جب طبعی علوم کا کوئی ایسا میدان نہیں جس کی انتہا تک انسان کا قدم پہنچ چکا ہو تو مابعد الطبیعات میں اس کا قطعی حکم لگانا کہاں تک مناسب ہے آج سے پچاس برس پہلے کون یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوتا کہ نباتات میں بھی احساس رنج و غم موجود ہے اور وہ بھی حیوانات کی طرح متاثر ہوتے ہیں لیکن سر جے۔ سی بوس کی تحقیقات سے آج یہ تقریباً یقینی ہو گیا ہے پھر ہمارے لئے کیا ایسی مجبوری ہے کہ ہم حواس انسانی کو محض پانچ تک محدود سمجھ لیں اور قطعی حکم لگا دیں کہ اس کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ نزول وحی پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہی تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام میں عام انسانوں کے خلاف یا ان سے بڑھ کر ایک طاقت یا حاسہ موجود ہوتا تھا جس کی مدد سے وہ ایسی چیزیں دیکھتے تھے جو عام انسان نہیں دیکھتے یا ایسی باتیں سنتے تھے جو عوام الناس نہیں سنتے

انسانی حواس اور قوی میں اس قدر فرق اور تدریج نظر آتی ہے کہ اس کا تو منطقی نتیجہ ہی یہی ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہو جس کے حواس اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ گئے ہوں یا جس میں فطری طور پر کوئی ایسا حاسہ موجود ہو جو عوام الناس میں موجود نہیں ہوتا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب ہم روز دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس میں حواس خمسہ میں سے کوئی حاسہ بہت کم یا یکسر ناپید ہے۔ ہمیں اس وقت تو تعجب نہیں ہوتا جب ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح دیکھ نہیں سکتا یا سُن نہیں سکتا لیکن اس وقت تعجب ہوتا ہے اور ہم اسے ناممکن بھی کہنے لگتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان نے وہ دیکھا جو ہمیں نظر نہیں آتا یا وہ سنا جو ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ تعجب یا شک تو ہو سکتا ہے اس لئے کہ پہلی صورت عامۃ الورود ہے اور دوسری صورت بالکل نادر لیکن اس کے کیا معنی ہیں کہ ہم اسے ناممکن قرار دیں اور قابل التفات ہی نہ سمجھیں مناسب طریقہ تو یہ ہے جہاں تک ممکن ہو صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد نئی صورت حالات پر غور کریں اور ضرورت ہو تو اپنے پرانے نظریہ میں تبدیلی کریں۔ رسول اللہ صلعم کی ابتدائی زندگی کے حالات، انکی صداقت و راست بازی، پھر وہ کیفیات جو پہلے پہلے نزول وحی کے سلسلے میں ان پر طاری ہوئیں اور حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور آخر میں وہ نتائج جو نزول وحی سے مترتب ہوئے ان سب کا مطالعہ کرنے کے بعد بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وحی کے امکان کو تسلیم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی خداوندی کا نزول ہوتا تھا۔ اس مختصر سے رسالے میں آتنی گنجایش نہیں ہے کہ وحی کے تمام دلائل پیش کئے جائیں اور اس کی تمام صورتوں سے بحث کیجائے اس لئے صرف اشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر عربی کی بہت سی تصانیف میں مفصل بحث موجود ہے۔ انگریزی میں بھی کافی کتابیں ملتی ہیں اور اردو میں بھی باوجود قلت کے اتنا مسالہ مل سکتا ہے کہ طلب صادق رکھنے والے کو تسکین قلب کا سامان فراہم ہو سکے[۱۵]۔

۱۵۔ نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ اصل کتاب کا

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کی معنویت فنا ہو گئی اور اس میں سیاسی رنگ زیادہ غالب نظر آنے لگا اور شروع شروع میں لوگوں پر جو اثر پڑا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو کارروائیاں کیں وہ دراصل سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنیکی غرض سے تھیں۔ ولہاوزن نے رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ یہی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد رسول نے مذہبی اثر سے فائدہ اٹھا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی وجہ سے انہیں تلوار اٹھانی پڑی اور خفیہ قتل کا موجب ہونا پڑا۔

غائر نظر سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ تعصب کے جس کی ہر جگہ کارفرمائی نظر آتی ہے اس قسم کے اعتراض کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ مذہب کا وہ ناقص تخیل ہے جو معترضین کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ عیسائی معترضین اسلام کو بھی عیسائیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دین کو سیاسی یا معاشی مسائل سے کیا سروکار ہے۔ انکا خیال ہے کہ اس میں صرف عبادات اور عقائد سے بحث ہونی چاہئے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے اسے بے تعلق رہنا چاہئے۔ خیر اگر عیسائی یہ اعتراض کریں تو سمجھ میں آنیکی بات ہے اس لئے کہ انکا مذہب جو دنیا سے قطع تعلق اور سیاست اور حکومت سے بے پروائی کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہمارا مضمون نگار جو خود یہودی ہے کس طرح یہ اعتراض کر سکتا ہے۔ یہود کے مذہب میں تو سراسر حکومت اور سیاست سے متعلق احکام ہیں اور حضرت موسیٰ کا تو مقصد ہی۔ جہانتک انکی تعلیمات اور ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ

وحی کی تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو:-

۱- کتاب دین و دانش - مولوی محمود علی ۲- الکلام - مولانا شبلی نعمانی

۳- سیرۃ النبی جلد سوم - مولانا سید سلیمان ندوی ۴- اسرار شریعت جلد سوم - مولوی محمد فضل خاں

ان کی تعلیمات میں بھی عبادات اور عقائد کا کافی ذکر ہے لیکن یہودیت کا اصل الاصول تو قواعد و احکام دنیوی ہی ہیں۔

اسلام کے علاوہ تاریخ سے جتنے مذاہب کا پتہ چلتا ہے انکی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک کو ہم قومی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو زوانی۔ قومی مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جن میں زیادہ تر سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی سے متعلق احکام ہیں یوں تو کوئی مذہب بھی ایسا نہ ہوگا جس میں عقائد اور عبادات کا ذکر نہ ہو لیکن مذاہب کی تقسیم یہاں انکے غالب رنگ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تقسیم میں عہد عتیق کے تمام مذاہب۔ یہودیت اور زرتشتی مذہب داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مذاہب ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں۔ دوسری قسم یعنی زوانی مذاہب سے وہ مذاہب مراد ہیں جن میں سراسر ترک دنیا اور تعبد و تقشف کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندومت۔ بدھ مت اور عیسائیت داخل ہیں۔ جن لوگوں نے ان مذاہب کی تعلیم کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ انکا غالب عنصر ترک لذات۔ قطع تعلقات دنیوی، فلسفیانہ غور و فکر اور عبادت و رہبانیت میں انہماک ہی۔ یہ تمام مذاہب اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور اپنے مخصوص عہد اور مخصوص حالات کے لئے بہترین مذاہب تھے لیکن نظر غائر سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی کامل مذہب نہیں ہے انسانیت کے ابتدائی دور میں اس میں شخصیت پیدا کرنے کے لئے اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کو واضح کرنے کے لئے ایسے مذاہب کی ضرورت تھی جن میں زیادہ زور انہی عناصر پر دیا گیا ہو، لیکن انسان تو عجیب قسم کی مخلوق ہے وہ جس طرف جھکتا ہے ادھر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ دوسرے رخ کو بالکل بھول ہی جاتا ہے چنانچہ ان تعلقات کی دیکھ بھال میں اس میں اتنی خود غرضی پیدا ہوگئی اور دنیاوی معاملات سے اس قدر شغف اسے ہوگیا کہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہونے لگا۔ اب ایسے مذاہب کی ضرورت پیش آئی جن میں زیادہ زور ان تعلقات کے قطع کرنے اپنی ہستی کو گم کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے پر دیا گیا ہو۔ اس

سے ردعمل ہوا۔ اور انسان نے روحانیت کیطرف توجہ کی لیکن ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں بھی وہی یک طرفہ شدت پیدا ہوگئی اور جائز دنیادی تعلقات سے بے نیازی کے باعث پھر شیرازہ عالم درہم وبرہم ہونے لگا۔ اب زندگی کے دونوں پہلو انسان کے سامنے تھے لیکن علیحدہ علیحدہ ایک طرف کچھ لوگ تھے جو سراسر دنیا میں محو تھے اور روحانیت سے بے نیاز۔ دوسری طرف ایک طبقہ تھا جو دنیا کی طرف رخ کرنا بھی حرام سمجھتا تھا اور یکسر تقشف و رہبانیت کی زندگی کو مقصد حیات سمجھتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تخلیق نہ اس کے لئے ہوئی تھی اور نہ اُس کے لئے۔ اس وقت ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہوئی جو دونوں عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور انسان کے لئے ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے جس کی پابندی سے اسکی تخلیق کا مقصد حاصل ہو۔ اسلام اسی طاقت کا نام ہے۔ اور اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام سے یہی مراد ہے۔ تمام دوسرے مذاہب نے اسی دین کے لئے زمین تیار کی تھی اور یہی اصل الاصول تھا جس کے لئے انسانی دماغ کی پرداخت کیجا رہی تھی۔ اسلام نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ نہ صرف دنیا سے کام چل سکتا ہے اور نہ صرف دین سے بلکہ دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود۔ اور جبتک مسلمان اس اصل الاصول کو نہیں بھولے وہ خود بھی کامیاب رہے اور تمام دنیا کو ان سے فائدہ بھی پہنچا۔ اور جیسے ہی انہوں نے اس مرکزی حقیقت کو فراموش کیا انکی ترقی تنزل سے بدل گئی۔ اور اب انکا وجود صفحہ عالم پر حرف غلط کی طرح رہ گیا ہے۔ اگر معترضین ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور تعصب کی عینک اتار ڈالیں تو ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام نے قدم قدم پر اس ہم آہنگی کے قائم رکھنے کی تائید کی ہے۔ اگر ایک طرف اس نے جائز دنیوی تعلقات کے قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے اور ایسے اصول بتائے ہیں جن کی پیروی سے انسان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی تمام پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں تو دوسری طرف اتنے ہی زور سے روحانی زندگی کو قائم رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے اور ایسے سامان فراہم کئے ہیں جن سے انسان کی روحانی احتیاج پوری ہو اور اسے ابدی مسرت اور دائمی خوشی حاصل ہو۔ قرآن کا ہر صفحہ اس دعوے کی دلیل ہے اور رسول کی زندگی کا ہر واقعہ اس حقیقت کا شاہد

دلائل و شواہد کی یہ کثرت ہے کہ انکار کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔

حیرت کا مقام ہے کہ معترضین کو رسول اللہ صلعم کی مکی اور مدنی زندگی میں کوئی ربط نہیں نظر آتا اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ان کی زندگی میں کوئی تغیر رونما ہوگیا تھا۔ مکے کا کام دراصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا جس پر مدنی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی قوم کو جو ضلالت و گمراہی کے عمیق ترین غار میں گری ہوئی ہو صحیح راستے پر لگا دیا جائے اس میں دینی احساس پیدا کیا جائے۔ اسے سمجھایا جائے کہ ایک اس سے بالا ہستی بھی ہے جس کے سامنے اسے جواب دینا پڑے گا۔ جب یہ حقیقت ایک گروہ کے ذہن نشین ہوگئی تو انہیں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تمام مسائل کی تعلیم دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ انسان کو دنیا میں کس طرح بسر کرنا چاہئے۔ اگر رسول اللہ صرف عقائد و عبادات کی تعلیم دینے پر اکتفا کرتے اور بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل نہ تیار فرماتے تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا جو عیسائیت کا ہوا تھا۔ سیاست و معاشرت کو دین سے علیحدہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے اس شعبے میں انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کے جذبات و عواطف کی ہدایت کے لئے کوئی شمع نہ روشن کیجائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاملات اور باہمی تعلقات میں انسان انتہائی خود غرضی اور بے رحمی سے کام لے گا اور صورت حالات وہ پیدا ہوگی جو آج کل یورپ میں ہے۔ عیسائیت کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر کوئی تمہیں ایک طمانچہ مارے تو دوسرے کے لئے بھی اپنے رخسار پیش کردو اور اگر کوئی تمہاری چادر چھین لے تو تم اسے اپنا کرتا بھی اتار کر دیدو لیکن آج عیسائی اقوام کا طرز عمل کیا ہے۔ بالکل اس کے خلاف۔ اگر انکا حق ایک گز زمین پر ہوتا ہے تو وہ اس وقت تک قانع نہیں ہوتیں جبتک ایک میل زمین حاصل نہ کرلیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انکے نزدیک دین کو سیاست یا معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ اس نے اپنے ابتدائی دور میں ایک ایسی جماعت تیار کردی جو اپنے تمام معاملات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی دین کی روشنی میں دیکھتی تھی اور جس کے باہمی تعلقات میں مساوات و اخوت کا ایسا خوشنما رنگ جھلکتا

تھا جو اب تک صفحات تاریخ کی زیب و زینت ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں اور کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو تاریک رہ گیا ہو۔ کامل دین وہی ہے جو انسان کی ہر دشواری میں خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ کام آئے۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ ماحول کتنا ہی بدل جائے لیکن انسان کے پاس ایسے اصل الاصول موجود ہوں جن سے سیدھا راستہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسلام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔ وہ ایسی شاہ راہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ باوجود تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے کہیں انسانی فکر کو پابند اور محدود نہیں کرتا۔ ہر جگہ انسان کو مناسب آزادی عطا کرتا ہے اور اسے اختیار دیتا ہے کہ مخصوص حالات اور واقعات کی مناسبت سے فروع میں تغیر و تبدل کر سکے اور ظاہر ہے کہ اصول کے تغیر کی تو کوئی دین اجازت دے ہی نہیں سکتا۔

ان سطور کے ملاحظہ سے ایک حد تک واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں اتنی معنویت موجود ہے جتنی انسان کے لئے ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کی تعلیمات عین منشائے تخلیق انسانیت کے موافق ہیں اور معترضین کے اعتراضات مذہب کے ناقص تخیل پر مبنی ہیں۔

تیسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اور کفار مکہ اور یہود کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان کی ذمہ داری رسول پر ہے اور ہمیشہ پیش قدمی انہیں کی طرف سے ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ الزام بھی ہے کہ بعض یہودیوں کو رسول اللہ صلعم نے خفیہ طور پر قتل کرا دیا۔ ان اعتراضات میں حقیقت کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں۔ مندرجہ ذیل سطور کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلعم کو مجبوراً اپنی حفاظت اور تبلیغ دین کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھانا پڑا تھا۔

آیت جہاد جس میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اس قدر واضح ہے کہ شک اور شبہے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی :-

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی	انہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی گئی اس لئے کہ ان پر

نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ
بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا
دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ
فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ
يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

سورۃ الحج (۲۲) آیت ۴۰ و ۴۱

ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ انکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو
صرف اتنا کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اپنے گھروں
سے ناحق نکالے گئے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے
لوگوں کے ذریعہ سے نہ روکتا تو صومعے، گرجا، عبادتگاہیں
اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے، مسمار ہو چکی
ہوتیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی
مدد کریں۔ بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

ان آیات کے پڑھنے کے بعد کیا یہ صاف نہیں ہو جاتا کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اس وجہ سے
دی گئی تھی کہ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ناحق انہیں گھروں سے نکال دیا گیا تھا اور
اس پر مستزاد یہ کہ ان سے جنگ بھی کی جاتی تھی اور اگر اس کی اجازت نہ ملتی تو اللہ کے نام لیوا دنیا سے مٹ
جاتے۔ یہاں تک تو اجازت جنگ کی وجہ بتائی گئی تھی اب اسکا مقصد ملاحظہ ہو:۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ
لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝

البقرہ ۲۔ ۲۵۔ آیت ۱۸۹

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف
اللہ کے لئے ہو جائے۔ اور اگر وہ رک جائیں تو زیادتی
ظالموں کے سوا کسی پر نہیں ہو سکتی۔

اس سے ایک طرف تو یہ صاف ہو گیا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ دور ہو جائے اور دین میں سوا اللہ کے
خیال کے دوسرے کا خوف یا ڈر باقی نہ رہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو گیا کہ فساد کرنے والے
اگر باز آجائیں تو پھر جنگ خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو لڑائی جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں
رہتا۔ یہ بھی ملاحظہ ہو کہ کن لوگوں سے جنگ کی اجازت ہے:۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

(۲۔ ۱۸۶)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ
کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں
کو پسند نہیں کرتا۔

کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہجاتا ہے کہ صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور دفاع سے سرمو تجاوز کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں اسی خیال کی تکرار ہے اور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں نہ تو خود مسلمانوں کو جبر واکراہ سے کام لینا چاہئے اور نہ جبر واکراہ برداشت کرنا چاہئے۔ جنگ کی اجازت انتہائی مجبوری کی حالت میں دی گئی ہے جب دنیا سے اللہ کے نام لیواؤں کے مٹنے کا خوف ہو۔ جب خدا کے دین کی تبلیغ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی ہوں تو خدا کے رسول کے لئے بجز اس کے کیا چارہ ہے کہ کمر ہمت باندھ کر کھڑا ہو جائے اور راہ حق سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنیکی کوشش کرے۔ ہاں اگر اس مقصد کے حاصل ہو جانیکے بعد محض حصول اقتدار یا جلب منفعت کی خاطر رسول لوگوں سے جنگ کرے تو البتہ وہ مورد الزام ہو سکتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا کیا۔ یا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بالکل آخری تدبیر کی صورت میں ہتھیار اٹھایا۔ کے میں ان پر اور انکے متبعین پر کیا کیا تکلیفوں کے پہاڑ نہ گرائے گئے۔ کونسا ایسا ظلم باقی رہگیا جو دین حق کے ماننے والوں پر نہ ڈھایا گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جب بے خانماں مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر پردیس میں جا بسے تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ مدینے کے قرب و جوار میں برابر انپر چھوٹے چھوٹے حملے ہوتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے حملے کی تیاری بھی جاری رہی۔ حواشی میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ جنگ بدر کے کیا اسباب تھے اور یہ کیسا بے بنیاد الزام ہے کہ رسول اللہ صلعم اور انکے ساتھی قافلے کو لوٹنے کی غرض سے نکلے تھے یہیں سے باقاعدہ جنگ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ احزاب کہاں ہوئی تھی۔ کیا اسمیں بھی رسول نے ہی پیش قدمی کی تھی کیا بار بار قریش مکہ اور انکے حلفا نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ نہیں کیا اور کیا مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا۔ اگر خدا کی مدد مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو انکا نام دنیا سے خارج ہو گیا ہوتا اور اللہ کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہتا حواشی میں ہر واقعے کے ضمن میں یہ بھی اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی کوئی جنگ جارحانہ

نہیں تھی۔ ابتدا میں تو انپر پے در پے حملے ہوتے رہے اور انہیں دم لینے کی فرصت ہی نہ ملی اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ انہیں دشمنوں کی تیاریوں کی خبر پہلے سے ملجاتی تھی اور وہ سلسلہ تقدم بحفظ انکو جڑ ہی سے کاٹ دینے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ یہ جنگوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک سے دوسرے کا سامان پیدا ہوتا تھا اور ہر جنگ کو علٰحدہ علٰحدہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ کفار قریش نے جبتک ان میں کچھ بھی دم باقی رہا اپنی تمام کوششیں رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں صرف کر دیں۔ تو کیا رسول اللہ صلعم کو یہ حق نہ تھا کہ ان کی تدابیر کا توڑ کرتے اور اپنی ہستی کو برقرار رکھتے اور اس دین کی تبلیغ کی آزادی کے لئے جس کے وہ حامل تھے کوئی صورت پیدا کرتے۔ یہ ہے حقیقت اس اعتراض کی کہ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں کہانتک صحت کو دخل ہے رہا بعض اکابر یہود کے خفیہ قتل کا سوال جسکا الزام رسول اللہ صلعم پر لگایا جاتا ہے۔ اسکی حقیقت بھی ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔ حواشی میں ہر اس واقعے کے سلسلے میں جہاں یہ الزام لگایا جاتا ہے الگ الگ تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور سب کے مطالعے کے بعد یہ صاف ظاہر ہو جائیگا کہ اس اعتراض کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔

چوتھا اور آخری اعتراض جس سے یہاں بحث کرنی منظور ہے یورپ کی نگاہ میں سب سے بڑا اعتراض ہے۔ کہا جاتا ہے کہ باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرنے اور لذات کے ترک کر دینے کے رسول اللہ صلعم میں ایک کمزوری باقی رہگئی تھی جس کا اظہار یوں ہوا کہ عام مسلمانوں کو انہوں نے صرف چار بیبیوں کی اجازت دی لیکن اپنی ذات کو اس کلئے سے مستثنیٰ کر لیا۔ معترضین کو اس میں خواہشات نفسانی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اعتراضات کی طرح اسکا انحصار بھی تعصب پر ہے اور کسی معترض نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنیکی کوشش نہیں کی ہے۔ اگر ازواج رسول اللہ صلعم کی فہرست پر ہم نظر کریں تو یہ اعتراض حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ بجز حضرت عائشہ رض کے تمام ازواج پہلے کسی نہ کسی کے عقد میں رہ چکی تھیں اور جب رسول اللہ صلعم نے ان

سے نکاح کیا تو ان کی عمریں شباب سے متجاوز ہو چکی تھیں دوسری طرف حضرت عائشہؓ کی عمر عقد کے وقت اتنی کم تھی کہ ایک عرصے تک وہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکیں اگر رسول اللہ صلعم واقعی نفسانی جذبے سے متاثر ہوتے تو ان کو جوان اور حسین خاتونیں عقد کے لئے نہ مل سکتی تھیں؟ عرب میں اس وقت کونسی عورت اس شرف سے انکار کر سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف بیوہ اور سن عورتوں سے شادی کی۔
اس کے بعد اگر ہم ان تعلقات پر نگاہ کریں جو رسول اللہ صلعم کے ازواج کے ساتھ تھے تو یہ مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس پرست انسان آزادی فکر اور آزادی عمل کھو بیٹھتا ہے اور عورتوں کی خواہشات کا پابند ہو جاتا ہے وہ جو کچھ حکم دیتی ہیں اس کی تعمیل اسے اپنی نظری کمزوری کی بنا پر لازمی طور پر کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے رسول اللہ صلعم کی شخصیت کا اثر ان کی ازواج پر بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان خاتونوں کو جن میں سے اکثر ناز و نعم کی خوگر تھیں آپ نے سادہ اور بے لذت زندگی کا عادی بنایا اور جب انہیں سے بعض نے زیادہ آرام سے زندگی بسر کرنیکی خواہش کی تو آپ نے ان سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ کیا وہ انسان بھی جو اپنے جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کبھی ایسا کر سکتا ہے۔
پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اتنی تعداد میں عقد کیوں کئے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عرب میں تعدد ازدواج عام طور پر رائج تھا اور اسے بالکل معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی تعلقات کی توسیع اور حلفا پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ دوسرے خاندان میں شادی کیجائے۔ بعض اوقات اگر کسی بیوہ کی کفالت منظور ہوتی تھی تو اس سے عقد کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے جو عقد کئے ان میں یہی مصالح پیش نظر تھے اور آپ کی اکثر ازواج ایسی خاتونیں تھیں جو اپنے سابق شوہروں کے انتقال کے بعد کفالت کی مستحق تھیں اور ان کی دلجوئی کی بہترین صورت یہی تھی کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خود اپنے عقد میں لے لیں۔ کبھی مغلوب قبیلے کا درجہ بلند کرنے کے لئے بھی رسول اللہ نے اس قبیلے میں عقد کیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین جویریہ سے اسی مصلحت سے عقد کیا تھا اور اس کا نتیجہ ہوا کہ انکا تمام خاندان آزاد ہو گیا اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعثت کے بعد جتنے نکاح کئے ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مصلحت ضرور تھی اور ان کا محرک ہرگز کوئی ادنٰے جذبہ نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ جب تحدید تعداد کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلعم اس سے مستثنٰی کیوں ٹھیرے اس میں بھی بے شمار مصالح ہیں اور ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے کہ اگر ایک طرف آپ کے لئے یہ رخصت تھی کہ چار سے زائد بیبیوں کو علٰحدہ نہ کریں تو دوسری طرف یہ سخت قید تھی کہ آپ کسی صورت میں اس کے بعد کوئی دوسرا نکاح بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عام مسلمانوں کو تو یہ اجازت تھی کہ اگر چار کی تعداد میں کمی ہو اور وہ چاہیں تو شرائط کی پابندی کے ساتھ اس تعداد کو پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلعم کسی حالت میں بھی کوئی عقد نہ کر سکتے تھے خواہ تعداد میں کتنی ہی کمی نہ واقع ہو۔ جدید عقد کی اجازت ختم ہو جانے کی تو یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جن مصالح کی بنا پر اپ عقد کرتے تھے وہ اب مکمل ہو چکے تھے یعنی اسلامی جماعت کی بنیاد خدا کے فضل وکرم سے بہت مستحکم ہو گئی تھی اور مصاہرت کے ذریعے سے کسی نئے قبیلے کو اپنا حلیف بناتے کی ضرورت نہ رہی تھی اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ باقی ازواج کو علٰحدہ نہ کرنے میں بھی کوئی اعلٰے مصلحت ہو گی اور اس میں ذاتی جذبے کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس موقعے پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اسی زمانے میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے کوئی اور شخص عقد نہیں کر سکتا تھا اور انہیں امہات المومنین کا درجہ دیا گیا تھا۔ ظاہر بیں معترض

اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم بھی رسول اللہ کے کسی ذاتی جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت تھی کہ ازواج مطہرات رسول اللہ صلعم کے اخلاق عادات اور انکی تعلیمات کی حامل اور انکا صحیح نمونہ تھیں۔ پھر آپ کے بعد ان کو کسی دوسری ہستی کا پابند نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ آزاد رہکر اس فیض کو جو رسول اللہ صلعم کی صحبت سے انہیں حاصل ہوا تھا عامۃ المسلمین تک پہنچانا چاہئے تھا اور اسی لئے ان کے متعلق یہ حکم نازل ہوا تھا۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اس حکم کی موجودگی میں اگر رسول اللہ صلعم علاوہ چار کے باقی ازواج کو علیحدہ کر دیتے تو ان کی کسقدر حق تلفی ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلعم کے فیض صحبت سے محرومی ان کے لئے کس قدر باعث تکلیف ہوتی۔ یہ تھی مصلحت اس استثنا کی ورنہ حقیقۃً معترضین کے باطل توہمات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بھلا وہ انسان جو ترک لذات دنیوی کی بہترین مثال ہو اور جسے خلق خدا کی ہدایت تفویض ہوئی ہو کبھی ایسے جذبات سے مغلوب ہو سکتا ہے جو تمام انسانی خوبیوں پر پانی پھیر دینے کو کافی ہیں۔

یہ چار بڑے اعتراضات تھے جو مستشرقین عام طور پر سیرۃ رسول اللہ صلعم پر وارد کرتے ہیں اور انہی سے اس مقدمے میں مختصر طور پر بحث کی گئی ہے۔ ارادتاً تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لئے کہ مقدمے کے از حد طویل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہر بحث میں اصولی مسائل کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ مقدمہ نگار کو اپنی خامیوں کا کما حقہٗ علم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ترجمے، مقدمے اور حواشی میں بہت سے نقائص ہوں گے۔ اہل نظر سے امید ہے کہ وہ ان سے ہرگز چشم پوشی نہ کریں گے بلکہ ان کو ظاہر کر دیں گے اس لئے کہ اس طرح قارئین بھی غلط فہمیوں سے محفوظ رہیں گے اور خود مولف کو بھی اپنی غلطیوں کا علم ہو جائے گا۔ صحیح تنقید علم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یہاں پر میں اپنے مکرم استاذ مولٰنا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ مجھے جو کچھ تھوڑا سا علم عربی ادب اور اسلامیات کا حاصل ہوا ہے وہ انہیں کے فیض سے حاصل ہوا ہے اور یہ تالیف بھی اگر وہ پوری مدونہ کرتے تو کبھی تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی ہدایتوں اور مشوروں سے مجھ سرفراز فرمایا۔

عبدالعلیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۲۴ اپریل ۱۹۲۹ء

ترجمہ

مع

حواشی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بانیٔ اسلام تاریخ کے صفحات پر نمایاں حیثیت سے ہجرت مدینہ کے ساتھ ساتھ جو ۶۲۲ء میں ہوئی رونما ہوتے ہیں، اور اسی تاریخ سے اسلامی سنہ کی ابتدا بھی ہوتی ہے۔ صحیح ترین حدیث کے مطابق تقریباً[1] بارہ برس پہلے وہ پہلی دفعہ نبی کی حیثیت سے مکہ میں ظاہر ہوئے۔ اور اس وقت ان کی عمر کم و بیش ۴۰ سال کی تھی۔ اس طرح ان کی ولادت ۵۷۰ء کے قریب ہوئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سال ابرہہ یمن کے حبشی والی، نے مکہ پر حملہ کیا تھا جس کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔[2] یہی سال تھا جب عربوں نے پہلی بار ہاتھی دیکھا تھا اور پہلی دفعہ چیچک کے مرض[3] میں مبتلا ہوئے تھے۔

---

[1] تیرہ برس۔ یہی روایت تمام روایتوں میں اصح و اقوی ہے۔ تقریباً کی ضرورت نہیں بلکہ تحقیقاً ایسا ہی ہے

[2] سورہ فیل (۱۰۵)

[3] چیچک کے مرض میں پہلی بار مبتلا ہونا محل بحث ہے۔ اس لئے کہ عرب میں قدیم سے چیچک کو جدری، اور جسے چیچک ہو مجدر کہتے ہیں برخلاف اس کے جو اس مرض سے محفوظ رہے اسے قرحان کہتے ہیں۔ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اصحاب فیل پر انہوں نے اس مرض کو عام دیکھا۔ اسی طرح ملک عرب میں بالخصوص حجاز میں ہاتھی اسی زمانہ میں دیکھا گیا ورنہ وہ لوگ جو سفر کے عادی تھے، ہند، فارس، حبش، یمن میں اسے دیکھتے ہوں گے۔

محمد (صلعم) کی پیدائش کے وقت اور انکی کم سنی کے زمانے میں عرب کی جو حالت تھی اس سے کسی طرح بھی اسکا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہاں کے بسنے والے اتنے جلد دنیا کی تاریخ میں فاتح روم و عجم کے نام سے پکارے جانے لگیں گے۔ تمام جزیرہ نما میں کوئی ایک آزاد ریاست بھی ایسی نہ تھی جس کی قوت یا اہمیت قابل ذکر ہو۔ چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں کندہ کے امیروں نے ایک قومی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی خفیف سی کوشش ضرور کی تھی اور خصوصاً وسط عرب کے قبائل کو متحد کرنا چاہا تھا لیکن اس سلطنت کی وقعت عربی تاریخ میں جس کی ابتدا واقعتاً اسلام کے ہاتھوں ہوئی ایک دیباچے سے زیادہ نہیں ہے۔ بنی کندہ کے زوال کے بعد نجد اور حجاز کے بدویوں میں پھر اسی پرانی نراجی کیفیت کا دور دورہ ہو گیا اور دوسرے حصوں میں رومی یا ایرانی اثر کارفرما نظر آنے لگا۔ اس سے نہ سرحدی قبائل بچے تھے اور نہ اندرون ملک والے۔ یہ کارفرمائی دو ماتحت ریاستوں کے توسط سے ہوتی تھی۔ حوران میں غسانیوں کی حکومت تھی جو رومیوں کے زیر اثر تھے، اور حیرہ وانبار میں لخمی حکمراں تھے جو ایرانیوں کو اپنا آقا سمجھتے تھے۔ بازنطین اور مدائن کی باہمی مخالفت کا رنگ عرب سرداروں کی خانہ جنگیوں میں جھلکتا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں کی اس تگ و دو اور مسابقت کا اثر جزیرہ نمائے عرب کے دور دراز جنوبی حصوں تک پہنچ گیا تھا۔ یونانیوں کے اکسانے سے حبشہ والوں نے عیسائیوں سے نفرت رکھنے والی حمیری حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور اس طرح عہد گزشتہ کی عظیم الشان سبائی سلطنت کی رہی سہی یادگار بھی ختم ہو گئی (۵۲۶ء)۔ ایرانیوں کی مدد سے ایک دیسی امیر[۱] نے کچھ دنوں کے بعد پھر عیسائیوں کو نکال دیا (۵۷۵ء) اور اس وقت سے ایران کے قدم عرب میں پھر جم گئے۔ چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں ایرانیوں کا اثر بالواسطہ اور بلاواسطہ یونانیوں سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا اور جب سے حیرہ کے ایرانیوں کے ہاتھوں کندہ کی سلطنت کو زوال نصیب ہوا۔ اس وقت سے تو یہ اثر نجد کو

---

[۱] یہ سیف بن ذی یزن حمیری تھا۔ اسکا واقعہ آنحضرت کی ولادت کے بعد کا ہے۔ یہ شخص بنی سلاطین کے خاندان سے تھا۔

لے کر کے یمن تک پہنچ گیا تھا۔

حجاز اور مغربی نجد میں جہاں سے اسلام اور عربی سلطنت کی ابتدا ہوئی، یونان یا ایران غسانی یا لخمی، کسی کا بھی کچھ زیادہ اثر نہ تھا۔ بدوی قبائل اور بعض حضری جماعتیں جو اس علاقہ میں موجود تھیں، خارجی مداخلت سے قطعاً محفوظ اپنے آبائی طریقے پر زندگی گذارتی تھیں۔ محمد (صلعم) کا وطن مکہ تھا جہاں بنی کنانہ نے کعبہ کے گرد جو اسی نواح کے چند معاہد قبائل (احابیش) کا معبد تھا ایک آبادی قائم کرلی تھی۔ ہر سال ماہ ذوالحجہ کی ابتدائی تاریخوں میں مکہ اور قرب وجوار مثلاً عرفات اور قزح[۵۲] میں ایک میلہ لگتا تھا۔ یہ میلہ حجاز کے تمام باشندوں کی دلچسپیوں کا مرکز تھا اور یہیں پر اہل مکہ بدویوں کے ہاتھ وہ مال فروخت کیا کرتے تھے جو وہ شام سے لاتے تھے۔ اس میلے کی وجہ سے مکہ کو بھی وہ اہمیت اور ثروت حاصل ہوگئی جو اسی طرح کے ان دوسرے شہروں کو حاصل تھی جو یمن کے دو قدرتی راستوں کے مقام اتصال کے قریب واقع تھے: ایک راستہ شمال و مغرب کا جو بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتا تھا اور دوسرا شمال و مشرق کا جو نجد کے پہاڑی سلسلہ کے دامن سے ہو کر گذرتا تھا۔

اپنے تجارتی سفر کی بنا پر قریش نے دنیا کے متعلق کافی معلومات حاصل کرلی تھیں اور خصوصاً یونانی۔ شامی۔ دنیا سے متعلق۔ نسبتاً اپنے تمدن کی فضلیت کی وجہ سے انہیں نہ صرف بدویوں پر ایک قسم کی فوقیت حاصل تھی بلکہ ایسی شہری آبادی پر بھی جو اہل مدینہ کی طرح زراعت میں مشغول رہا کرتی تھی پڑھنے لکھنے کا فن بھی ان میں اچھی خاصی طرح رائج تھا۔ قریش میں سے بنی کعب بن لوئی شہر میں رہا کرتے

---

[۵۱] اسلام سے قبل عرب کی حالت معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو:- Causin de Perceval
Essai, Sürl histoire
des Arabes Vol. II.

Muir—The Life of Mahomet.

[۵۲] قزح مزدلفہ کا نام ہے جبل قزح جسے مشعر الحرام بھی کہتے ہیں وہ مقام ہے جس کے اردگرد حاجی عرفات کے بعد رات گزارتے ہیں، اور صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس سے کچھ پہلے تک یہاں دعا کرتے ہیں۔

تھے اور بنی عامر بن لوی پاس کے گاؤں میں۔ پھر شہر کے رہنے والوں کے بھی دو حصے[۱۵] تھے مطیّبون اور احلاف۔ موخرالذکر نئے نئے آکر بسے تھے اور پرانی آبادی سے الگ سمجھے جاتے تھے۔ عرب کے دوسرے بڑے شہروں مثلاً طائف اور حیرہ میں بھی یہ لوگ اسی نام سے موسوم تھے۔ اس قوم کی حیثیت آس پاس کے چند قبائل کے مجموعے سے زیادہ نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک کی جائے سکونت الگ الگ تھی۔ کوئی مشترکہ عملداری نہ تھی اور نہ شہر کا بحیثیت مجموعی کوئی درجہ تھا۔ تمام اختیارات مختلف قبائل یا انکے سرداروں میں مرکوز تھے اور اگر وہ باہر والوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سب کا مفاد ایک تھا سب میں ایک قسم کا احساس شرافت موجود تھا اور یہ ایک خود اختیاری اتحاد تھا جسے رائے عامہ سے تقویت پہنچتی رہتی تھی۔ محمد (صلعم) کے زمانہ میں سب سے زیادہ مالدار اور سب سے بڑا خاندان بنو مخزوم کا تھا لیکن مرتبہ اور عزت میں بنو عبد شمس سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اب بنو عبد شمس میں بنو امیہ زیادہ طاقتور سمجھے جاتے تھے اور انکے سردار ابو سفیان بن حرب کی رائے تمام جماعتی مسائل میں بہت وقیع خیال کیجاتی تھی۔ محمد خود

---

[۱۵] شہر کے رہنے والوں کے یہ دو حصے ابتدا سے نہ تھے بلکہ آخری ایام میں جنگ کیوجہ سے یہ تفریق ہوگئی۔ قصی کے بعد قریش کے اس طرح دو حصے ہوگئے کہ ایک طرف بنو عبد مناف بن قصی اور ان کے ساتھی تھے۔ انہوں نے خوشبو میں ہاتھ ڈالکر حلف اٹھایا اس لئے یہ مطیبون کہلائے۔ دوسری طرف بنو عبد الدار بن قصی تھے انہوں نے خون میں ہاتھ ڈالکر حلف اٹھایا یہ لوگ احلاف یا لَعقَۃ الدم کہلائے اس کی وجہ یہ تھی کہ قصی نے اپنی وفات کے وقت خانہ کعبہ کی تمام خدمتیں عبدالدار کو جو اسکا پہلا بیٹا تھا سپرد کردیں عرصہ کے بعد دوسری اولاد نے یہ سمجھکر کہ ان میں ہمارا بھی حق ہے نزاع کیا اور مذکورہ بالا دو فرقے ہوکر جنگ پر آمادہ ہوئے مگر کسی قسم کی خونریزی ہونے سے پہلے اس طرح مصالحت کرلی کہ سقایۃ و رفادۃ بنی عبد مناف کو دیا وے، حجابۃ، لواء، اور دارالندوہ بنو عبدالدار کے پاس رہے۔ ملاحظہ ہو ابن سعد ج ا ق ا صفحہ ۴۳ ابن ہشام بہامش الروض الانف ج ا صفحہ ۹۰ سکونت کے اعتبار سے دو حصے حسب ذیل تھے قریش البطاح، قریش الظواہر جو لوگ خانہ کعبہ کے اردگرد بطح میں آباد ہوئے وہ قریش البطاح کہلاتے ہیں قریش الظواہر بنو عامر بن لوئی میں سے معیص بن عامر اور بنی فہر وغیرہ جو آس پاس کے گاؤں میں رہے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ابن سعد ج ا ق ا صفحہ ۳۹-۴۰

بنو ہاشم میں سے تھے اور کہا جاتا ہے کہ یہ گھرانہ قوت اور اقتدار کے لحاظ سے پہلے وہی حیثیت رکھتا تھا جو بعد میں بنو امیہ کے حصہ میں آئی لیکن ظاہرا یہ خیال اس وقت کا پیدا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے جب مدتوں کے بعد بنو ہاشم (آل علی وآل عباس) نے امویوں کے خلاف طاقت حاصل کرنے کے لئے صف آرائی کی[۵۱]

محمد (صلعم) کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کو اپنے لڑکے کی ولادت دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا اور ان کی والدہ آمنہ اس وقت فوت ہوگئیں جب آپکی عمر بہت کم تھی۔ اس لئے محمد (صلعم) کی دیکھ بھال شروع میں تو انکے دادا عبدالمطلب کرتے رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ فرض انکے سب سے بڑے چچا ابو طالب بن عبدالمطلب کے ذمہ رہا۔ انکے ساتھ بہت شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا تھا مگر ایک مفلس اور کثیر التعداد خاندان کے افراد کو جو تکلیفیں مجبوراً برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ ان کے حصہ میں بھی آئیں۔ وہ بھیڑیں چرایا کرتے تھے اور جنگلی بیر توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ہمیں انکے بچپن کے حالات اور کچھ نہیں معلوم (سورۃ ۹۳-۶) اس لئے کہ اور جو کچھ بیان[۵۲] کیا جاتا ہے وہ ایک افسانہ ہے اور اسمیں شاید ہی کہیں کہیں حقیقت کو دخل ہو تو ہو۔

---

[۵۱] ملاحظہ ہو:۔ Sprenger Vol. III. P. C X X sq.—

[۵۲] مضمون نگار نے اس جگہ نہایت عجلت سے کام لیکر تمام دیگر معلومات کو افسانہ قرار دیا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں آپ کے حالات واوصاف میں صداقت وامانت، حسن اخلاق، لہو ولعب سے اجتناب خاص قابل ذکر ہیں۔ بنائے خانہ کعبہ کے وقت آپ کو حجر اسود رکھنے کے واسطے پسند کرنا، خانہ کعبہ کی عمارت میں آپ کی شرکت، حرب فجار کی شرکت حلف فضول کی شرکت جو مظلوموں کی حمایت کے لئے اٹھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر بعض اہم معلومات بھی ہیں مثلاً آپ کی بعض اولاد کا نام عبدالعزی ہونا، قریش کے عام میلوں میں آپ کی شرکت نبوت سے قبل کسی قسم کی مخالفت مذہبی کا نہ ہونا ووجدک ضالاً فہدی (۹۳: ۷) وماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان (۴۲-۵۲) کی توضیح ہے۔ غرض آپ کے قبل النبوۃ کے جستہ جستہ حالات اب تک صحیح طریق سے ثابت اور واضح ہیں۔ جن کی وجہ سے

کہا جاتا ہے کہ جب محمد (صلعم) کی عمر پچیس سال کی ہوئی تو اس وقت وہ ابو طالب کی سفارش سے ایک مالدار بیوہ خاتون خدیجہ کے کاروبار میں شریک ہو گئے۔ انکے واسطے محمد (صلعم) نے بہت سے تجارتی سفر کئے اور اس طرح شام اور فلسطین کے بعض حصوں سے کچھ کچھ واقف ہو گئے اور غالباً ایسے اثرات[1] بھی قبول کئے جنہوں نے انکے دل پر ایک گہرا نقش ڈالا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے خدیجہ رضؓ سے عقد کر لیا۔ وہ طبعاً ذہین تھے ان کے چہرے سے رعب ٹپکتا تھا۔ رنگ انکا صاف تھا اور بال سیاہ تھے یہ تعلق بہت خوشگوار ثابت ہوا اور کئی بچے بھی پیدا ہوئے۔ لڑکے صرف دو ہوئے جو کم سنی ہی میں انتقال کر گئے ان میں سے بڑے کے نام پر محمد (صلعم) کی کنیت ابو القاسم قرار پائی۔ لڑکیوں میں سب سے زیادہ مشہور فاطمہ ہوئیں جنکا عقد انہوں نے اپنے چچیرے بھائی علی بن ابی طالب سے کر دیا تھا۔

اسی زمانہ میں جب کہ وہ خدیجہ رضؓ کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے محمد (صلعم) ایک ایسی مذہبی تحریک سے روشناس ہوئے جس سے مکہ، مدینہ، اور طائف کے بعض سمجھدار آدمی بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے۔ مکہ اور دوسرے مقامات میں بھی عربی بت پرستی آبائی مذہب کی حیثیت رکھتی تھی اور ان تہواروں کو خصوصیت کے ساتھ مرکزیت حاصل تھی جو مقدس مقامات پر منائے جاتے تھے، عبادت کا یہ طریقہ محض اس وجہ سے رائج تھا کہ باپ دادا کے زمانے سے ایسا ہوتا چلا آتا تھا۔ بت تعداد میں بہت تھے اور ان کی

مستشرقین کے بہت سے شکوک و اوہام باطل ہوتے ہیں، انکی تفصیل کتب حدیث و رجال و سیر میں ہے۔

[1] عموماً عیسائی دنیا اسی قسم کے مبہم الفاظ سے اپنا یہ مطلب نکالتی ہے کہ آئندہ چلکر جو نبوت کا دعویٰ کیا وہ اسی سفر میں حاصل کیا ہوا علم تھا۔ جسے اس طرح ظاہر کیا گیا مگر نہ تو ایسے سفروں میں کبھی اس قسم کا چرچا ہوا، نہ کسی کافر نے جو ہم سفر رہے کبھی ایسا گمان یا دعوےٰ کیا۔ حالانکہ بہ نسبت ساحر، شاعر، اور دیگر الزامات کے یہ نہایت عمدہ الزام تھا۔ پھر اگر آپ تعلیم، کتابت وغیرہ کے سلسلہ سے بے بہرہ ہونے کے باوجود ایسا علم حاصل کر سکتے تھے تو مکہ کے دوسرے تجار جو ہر طرح اس کے واسطے زیادہ موزوں تھے۔ کیوں نہ اٹھے؟ وہ تحریر و تقریر میں بھی طاق تھے۔ چاہئے تھا کہ اُن میں سے بھی کوئی ایسا دعوےٰ کرتا۔

اہمیت کی بنا ان صفات پر نہیں تھی جو ان سے منسوب کیجاتی تھیں بلکہ اس تعلق پر جو انہیں پجاریوں کے کسی خاص حلقے سے تھا۔ وہ خاندانوں اور قبیلوں کے سرپرست تھے[1] اور گویا ان روابط کا مجسمہ جو کسی خاندان یا قبیلے کے مردہ اور زندہ افراد کے درمیان قایم تھے۔ ان سب سے برتر اور اعلیٰ اللہ تھا جو سب سے بڑا اور عالمگیر دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ مقدس ترین قسمیں اسی نام کی کھائی جاتی تھیں اور صلح ناموں یا معاہدوں پر اسی کے نام کی مہر ثبت کیجاتی تھی (باسمک اللھم) ادنےٰ درجے کے دیوتا ایسے مواقع پر یاد کئے جانے کے قابل نہیں سمجھے جاتے تھے اس لئے کہ انکا تعلق اکثر صرف ایک فریق سے ہوتا تھا اور دونوں کی حفاظت کی ان سے امید نہ ہوتی تھی۔ دشمن کو وحشیانہ مظالم سے باز رکھنے کے لئے اللہ کا واسطہ دلایا جاتا تھا اور ایک مفسد کے لئے سب سے بڑی گالی۔ خدا کا دشمن (عدو اللہ θεοστυγης) کہنا تھا لیکن چونکہ اللہ سب کا حاکم تھا اور سب پر یکساں فرائض عائد کرتا تھا اس لئے یہ ممکن تصور نہیں کیا جاتا تھا کہ کوئی انسان براہ راست اس سے قریبی تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ عبادت میں وہ سب سے آخری درجہ رکھتا تھا اور ان دیوتاؤں کو ترجیح دیجاتی تھی جو کسی خاص حلقے کی نمائندگی کرتے تھے اور جو اپنے مخصوص پجاریوں کے ذاتی اغراض کو پورا کیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ نہ تو اللہ کا خوف کوئی خاص اثر رکھتا تھا اور نہ دیوتاؤں کی عظمت، تہواروں کے انعقاد سے جو عملی فائدہ ہوتا تھا وہ صرف یہ تھا کہ مقدس مہینوں میں جنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن ایک زمانہ کے گذرنے کے بعد یہ مسئلہ بھی محض ذاتی سہولت کا رہگیا۔ عام طور پر بت پرست عربوں کا میلان طبع۔ اگر واقعی انکی شاعری میں انکا اصلی رنگ جھلکتا ہے، غیر معمولی حد تک فسق و فجور کیطرف تھا۔ مینوشی، شکار، قمار بازی اور عشق ایک طرف، انتقام، خانہ جنگی، غارتگری اور خواہش نام و نمود دوسری طرف یہی انکے شعرا کے تخیل کی کل کائنات تھی۔ اچھے کاموں کے لئے اگر کوئی ترغیب ہو سکتی ہے تو وہ احساس شرافت ہے یا خاندانی حمیت۔ دیوتاؤں کا نام مشکل سے ان کی زبان پر آتا ہے اور وہ قطعاً ان کی ضرورت

---

[1] بت ہر گھر میں ہوتے تھے اور لوگ گھر سے باہر جاتے وقت یا گھر واپس آتے وقت ان سے برکت طلب کیا کرتے تھے ابو بجرات بت بنا کر بیچا کرتا تھا اور بدوی انہیں عام طور پر خریدتے تھے۔ واقدی صفحہ ۳۵۰ (د)

محسوس نہیں کرتے۔ شمرد کامل اعتماد صرف اپنے نفس پر کرتا ہے، وہ تنہا ریگستانوں کا سفر کرتا ہے خطرے کے وقت اس کی مدد بجز اس کی تلوار کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ نہ تو کوئی خدا اس کی حفاظت کرتا ہے اور نہ وہ اپنی روح کو کسی ولی کے سپرد کرتا ہے۔ اسکی بے پروا خود پرستی بڑھ کر خاندان یا قبیلے کے لئے شریف قربانی کی شکل اختیار کرسکتی ہے لیکن اس کی بہادری کے کارناموں میں مذہبی جذبے کو کوئی دخل نہیں، اور نہ ان سخت، صاف لیکن بایں ہمہ پر از جذبات طبایع میں روحانیت کی کوئی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک ہلکا سا رنگ اس احساس کا جسے کسی طرح مذہبی کہا جاسکتا ہے ان پر اس وقت چڑھتا ہے۔ جب کوہ آتش فشاں جل چکتا ہے، اور زندگی کا طوفان ختم ہو چکا ہوتا ہے اُس وقت ممکن ہے کہ گذری ہوئی سیمابی کیفیت پر افسوس کا ایک کلمہ سنائی دے ؎۲ بہت ممکن ہے کہ بہ نسبت بدؤں کے، جو تقریبًا تمامتر شاعری کے مالک تھے،

؎۱ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب کی شاعری میں بت پرستی کے متعلق بہت کم معلومات ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ کہتے نہ تھے بلکہ اسلام کے بعد اس قسم کا ادبی سلسلہ ایک حد تک فنا ہوگیا۔ اب تک لات، عزیٰ، اور دیگر بتوں کی قسمیں، انکی منتیں وغیرہ اشعار میں موجود ہیں۔

؎۲ اَرَانَا مُوضِعِینَ لِحَتمِ غَیبٍ　　وَنُسحَرُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

میں دیکھتا ہوں کہ ہم ایک نامعلوم غرض کے لئے رکھے گئے ہیں لیکن ہم تو اپنی رنگ رلیوں میں مست ہیں

عَصَافِیرٌ وَذِبَّانٌ وَدُودٌ　　وَاَجرَأُ مِن مُجَلَّحَۃِ الذِّیَابِ

بساط تو ہماری بھیڑ، مکھی اور کیڑے مکوڑے سے زیادہ نہیں لیکن جرأت میں بھوکے بھیڑئے سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں،

اِلیٰ عِرقِ الثَّریٰ وَشَجَت عُرُوقِی　　وَھٰذَا المَوتُ یَسلُبُنِی شَبَابِی

اگرچہ میری جڑ زمین کی گہرائی تک پہنچ گئی ہے لیکن یہ موت مجھ سے میری جوانی چھین لے گی

وَنَفسِی سَوفَ یَسلُبُنِی وَجِرمِی　　وَیُلحِقُنِی وَشِیکًا بِالتُّرَابِ

اور عنقریب میری روح کو میرے جسم سے الگ کر کے مجھے خاک میں ملا دے گی

امرؤ القیس مرتبہ آلوارڈ ت صفحہ ۱۲۰

شہری عربوں کی نگاہ میں مذہب کی اہمیت زیادہ رہی ہو، لیکن یہ فرق کچھ بہت بڑا نہ رہا ہوگا۔ مکہ کے قدیم باشندے زہد و تقوے کو تجارتی حیثیت سے اختیار کرتے تھے۔ یہی حال آجکل بھی ہے۔ اس لئے کہ انکی تجارت کا دارومدار حج پر تھا اور اس میلے کا حرم کی حرمت یا مقدس مہینوں کی چند روزہ صلح پر[1]

محمد (صلعم) سے قبل عربوں کے عقیدے بہت کمزور اور بھپھسے تھے۔ اکثر واقعات اور بیشتر اشعار شاہد ہیں کہ مذہب سے عدم توجہی اور دیوتاؤں سے تمسخرانہ لاپروائی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ گو کھوئے ہوئے دین کے نعم البدل کی جستجو عام نہ تھی لیکن چند افراد ایسے بھی تھے جو اس منفیانہ کیفیت سے مطمئن نہ تھے اور ایک بہتر دین کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ طائف میں امید بن ابی الصلت، مکہ میں زید بن عمرو اور مدینہ میں ابو قیس بن ابی انس اور ابو عامر اس قسم کے لوگ تھے۔ یہ حنیف کہلاتے تھے غالباً[2] جس کے معنی ہیں "توبہ کرنے والے"، یا وہ لوگ جو گناہ سے چھٹکارا حاصل کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی باقاعدہ فرقے کی شکل میں نہ تھے اور نہ درحقیقت انکے خیالات ہی کوئی مرتب صورت اختیار کرچکے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے مگر انکی حیثیت ایک منظم جماعت کی ہرگز نہ تھی انہیں تبلیغ سے زیادہ اپنی روح عزیز تھی اور صرف مدینے[3] ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ انکی تعداد کچھ زیادہ

---

[1] عربی بت پرستی سے متعلق ملاحظہ ہو:- Pococke: Specimen Hist. Arabum

Krehl: Religion der Vorislamischen Arabe (Leip—1863)

3. Sprenger—Vol,I. 241 Sq.

[2] حنیف وہ لوگ کہلاتے تھے جو آبائی رسوم کے مطابق بتوں کی پرستش میں حصہ نہ لیتے، حشر و نشر کے معتقد تھے اور حضرت ابراہیم کے مذہب پر اپنے آپ کو سمجھتے تھے، حنیف کے معنی مڑا ہوا ایک طرف۔

[3] یہ غلط ہے، مدینہ میں یہودیوں کی کثرت تھی۔ مگر اس قسم کے بہت سے لوگوں کا ذکر کسی معتمد کتاب میں نہیں ملتا۔

تھی۔ انہوں نے شرک سے انکار کر دیا تھا اور اللہ کو مانتے تھے لیکن یہ عقلی دلائل کا تقاضا نہ تھا بلکہ انکے ضمیر کی آواز تھی ایک خدا کو ماننا، اور اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا (اسلام) انکے لئے ایک ہی بات تھی انکی توحید کو احساس فرائض اور یوم الجزا کے خیال سے بہت قریبی تعلق تھا۔ اس کو بت پرستوں کے دنیاوی خیالات سے کوئی سروکار نہ تھا اور گویا ایک ہدایت تھی گناہ سے بچنے کی اور سیدھے راستے کیطرف۔ وہ لوگ اصولئیین نہ تھے بلکہ عابد اور زاہد تھے۔ عہد عتیق اور انجیل کے بہت پرانے خیالات (دین ابراہیم) تھے جو ان میں دوبارہ جاگ اٹھے تھے۔ مجموعی طور پر وہ الہامی[1] دین کی ترقی یافتہ صورتوں کیطرف کم میلان رکھتے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ کوئی نئی صورت پیدا ہو جائے اسی لئے ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اس زمانے کی کسی مذہبی جماعت میں داخل ہوئے۔

محمد (صلعم) جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، ان حنفا سے اپنی بیوی کے ایک چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل[2]

---

[1] جو لوگ حنیف تھے وہ یہود و نصاریٰ سے مل چکے تھے، اُنکے نزدیک صحیح توحید اور صداقت انکے یہاں نہ تھی، رسوم اور شرکی اعتقادات کی کثرت نے انہیں اُن مذہبوں سے برگشتہ کر دیا تھا۔ بعض عیسائی اور یہودی بھی ہو گئے تھے۔ امیہ بن ابی الصلت نیم عیسائی تھا۔ عام طور پر یہود و عیسائی آنیوالے نبی کے منتظر تھے۔ اس کا چرچا غالباً ان لوگوں نے بھی سنا ہوگا۔ اس لئے وہ منتظر تھے۔ امیہ تو اپنے آپکو اس کا اہل بھی سمجھنے لگا تھا۔ مگر دعوے کا موقع نہ ملا۔

[2] ورقہ بن نوفل کے متعلق مضمون نگار کا یہ خیال کہ وہ حنیف تھے محض قیاس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا وہ منجملہ اُن لوگوں کے ایک تھے جنہوں نے مذہب کی تلاش کی، زید بن عمرو نے یہود اور عیسائیوں سے ملنے کے بعد طے کیا کہ مذہب ابراہیم دین حنیف ہے، اور اسی پر زندگی گذارنی چاہیئے۔

ورقہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اگرچہ انہوں نے کوئی تبلیغ نہ کی مگر وہ کتب عہد قدیم وجدید سے واقف اور عبری زبان سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ ہموطن و رشتہ دار ہونیکی وجہ سے آپ کی ملاقات ضرور تھی، مگر کیا انکی علمی تحقیقات سے بھی مستفید ہوئے ہ یا اور کوئی مستفید ہوا، اس پر ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں ہے، ظاہرا

کے ذریعہ سے جو خود بھی خفیف طور روشناس ہوئے۔ انکے دل میں ان عقائد کو ایک بار آور زمین ملی۔
ان میں یک بیک ایک قادر مطلق اور حاضر و ناظر ہستی کی اطاعت اور اس سے متعلق اپنی ذمہ داری کا
زبردست احساس پیدا ہو گیا۔ بوڑھے زید بن عمرو کی مثال کو سامنے رکھ کر وہ اکثر کئی کئی روز تک ویران
اور سنسان غار حرا کی تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر اور عبادت کیا کرتے تھے شاید برسوں تک وہ اسی قسم
کی انفرادی ریاضت میں لگے رہے اور کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے انہیں اسی خیال کے اور لوگوں
سے کوئی امتیاز حاصل ہو سکے۔ لیکن اس دفعہ حنیفی خیالات نے ایسی فطرت میں گھر کیا تھا جو ابتدا
ہی سے ہیجان اور وہم کی طرف مائل تھی اور بالآخر جوش کھا کر پھوٹ نکلے۔ اس طرح وہ ایک نبی ہو گئے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) وہ قوم سے مرعوب ہونیکی وجہ سے نئے دین کو پھیلانے کے واسطے تیار نہ تھے۔ صحیحین کی حدیث میں
انکے عیسائی ہونیکا ذکر ہے اُنہی کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بی بی خدیجہ پہلی مرتبہ وحی کے بعد لائی تھیں۔

ؔ زید بن عمرو سے آپ کی ملاقات تھی۔ مگر نہ تو زید نے کوئی ایسا طریقہ عبادت کا اختیار کیا تھا جس کا نمونہ آپ کے
روبرو ہو، نہ آپ اس قسم کے امور سے کچھ متاثر ہوئے۔ کتب حدیث و سیر میں مذکور ہے کہ آپنے ایک مرتبہ زید کو
کسی میلہ میں کھانے پر بلایا، مگر زید نے یہ کہہ کر کہ "میں تہوار کے ذبائح نہیں کھاتا"، شرکت سے انکار کر دیا۔ اس سے
صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس قسم کے حنفاء سے متاثر نہ تھے۔ ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۵۳ (مع الروض الانف) میں یہ
واقعہ مذکور ہے کہ قریش جاہلیت میں حرا، ثور وغیرہ پر ایک ماہ کا اعتکاف کرتے تھے، جس میں کچھ ذکر اور افعال
خیر ہوتے تھے۔ اس طریقہ پر آپنے بھی عمل کیا، ممکن ہے یہ ابراہیمی طریق کہا جاتا ہو اسے تحنث یا تحنف کہتے تھے جس کے
معنی گناہ سے اجتناب یا لوگوں سے دور ہونیکے ہیں۔ غرض حنفاء کے کسی خاص طریقہ کے بجائے قریش کے جاہلیت میں یا
جو عمدہ اطوار تھے آپ انہیں پسند کر کے عمل کرتے تھے۔

ؔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ آپ کو حنفاء سے کوئی تعلق نہ تھا، نہ آپ کی طبیعت میں کسی خاص ہیجان و وہم کا سلسلہ پایا
جاتا تھا۔ بلکہ فطرت سلیمہ و اخلاق حسنہ جو آپ کی طبیعت تھی، جس سے آپ غربا مساکین کی اعانت کرتے مظلومین
کی دادرسی میں شریک ہوتے۔ اس قسم کے نیک امور جو عرب میں عام تھے، بالخصوص اہل مکہ جو ابراہیمی دین کے

اور اب انہوں نے اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پایا کہ زاہدوں کے خاموش حلقے سے باہر آکر حق کی تبلیغ کریں۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُنکے اس ارادے کو اُس علم نے ایک حد تک تقویت بخشی ہو جو انکو توراۃ[۵۱] اور انجیل کے قدیم انبیاء کے متعلق تھا۔ اور غالباً اس بات کا بھی کچھ اثر ضرور رہے کہ حنفاء کے دلوں میں کسی نئے مذہب کے بانی کے لئے ایک تڑپ عام طور پر پائی جاتی تھی اور جس کی تائید اُس دھندلی سی واقفیت سے بھی ہوئی جو یہودیوں کی اس امید کے بارے میں انہیں تھی کہ بہت جلد ایک نبی کا ظہور ہونیوالا ہے۔

یہ تو یقینی ہے کہ محمد (صلعم) نے اپنے خیالات خود بلا واسطہ نہیں قائم کئے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ حنفاء سے ماخوذ ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اسلام کیطرف یہ پہلا قدم جو اٹھا ہے اسکا اصلی ماخذ[۵۲] کیا ہے؟

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳) نام لیوا تھے انمیں بہت سے اثرات اس دین کے باقی تھے۔ ان میں آپنے پرورش پائی مگر کسی خاص قسم کا رجحان دین حنیف کیطرف اپنی قوم کی مخالفت، اُنکے رسوم شرک وضلالت سے اجتناب کا کوئی ذکر قبل از نبوت آپ سے ظاہر نہیں ہوا۔ بخلاف اس کے آپ کی شرکت کا ذکر پایا جاتا ہے جو واضح ترین طریق سے مذکور ہے۔ پس ایسی حالت میں یہ قیاس محض غلط اور مردود ہوگا۔

سلہ آپ نے کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ جسقدر آپ کے سفر و حضر کے واقعات ہیں اُن میں کوئی سلسلہ ایسا نظر نہیں آتا جو اسپر کوئی روشنی ڈال سکے۔

اگر بالفرض کسی راہب سے ایک دو ملاقات مان لیں تب بھی اس علم کا کیونکر اقرار کیا جا سکتا ہے؟ اہل مکہ کے پاس دین ابراہیمی کا کچھ حصہ تھا۔ نماز، حج اعتکاف کا ذکر خاص طور پر آتا ہے، غار حراء میں آپ کا رہنا اعتکاف کہلاتا ہے، اسمیں کسی جدید ظن و وہم کی ضرورت نہیں، مزید برآں اگر آپ کو کسی قسم کا علم ہوتا تو ابتداء وحی کے ایام میں اس طرح پریشان نہ ہوتے۔

سٹہ واقعات اور صحیح معلومات سے نتیجہ نکالنا چاہئے، یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ آپ کسی یہودی عالم یا عیسائی راہب سے اس قسم کی صحبت رکھتے تھے۔ حالانکہ دوسرے لوگ ایسی صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے، حنفاء

عام طور پر تو اس کی نسبت یہود سے کیجاتی ہے۔ حجاز اور یمن میں یہود کثرت سے آباد تھے۔ عربوں سے انکے تعلقات بہت وسیع تھے اور انہیں ایک حصہ انجیلی اور مذہبی مواد کا بلاشبہ یہود نے فراہم کیا ہے محمد (صلعم) تو خاص طور پر تقریباً تمام قصوں کے لئے اور اکثر قوانین مثلاً ازدواج۔ طہارت وغیرہ) کیلئے یہود کے رہین منت ہیں اور اسلام کی مذہبی زبان میں بھی یہودی الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ لیکن اسلام کی ابتدائی اور تخلیقی قوتوں کا منبع ہرگز یہودیت نہیں ہے بالخصوص سزا و جزا کے خیالات اور ان سخت فرائض کا تخیل جو خالق نے مخلوق پر عائد کئے ہیں اور یہی دونوں قرآن کی قدیم سورتوں میں جاری

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴) اور اس قسم کے خیال والوں سے ضرور ملاقاتیں تھیں، اگر چالیس برس کی عمر تک کوئی طرز، طریقہ ایسا نہیں ثابت ہو سکا کہ اس قسم کے خیال سے آپکو خاص اُنس معلوم ہو، بخاری وغیرہ کی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ عام میلوں میں شرکت فرماتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے زید بن عمرو کو اپنے دسترخوان پر بلایا، مگر انہوں نے یہ کہکر شرکت سے انکار کر دیا کہ میں ایسے تہواروں پر جو ذبح ہوتا ہے اُسے نہیں کھاتا، اس قسم کے معلومات سے یہ دعوے غلط ہو جاتا ہے کہ آپ اس سے متاثر ہوے، نہ آپ کی پہلی زندگی میں کوئی ایسا اثر پایا جاتا ہے کہ آپنے ایسی کوئی رائے ظاہر فرمائی قرآن مجید میں صاف ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدىٰ، پس محض خیالی بنیادوں پر ایسا دعوے قابل سماع نہیں ہو سکتا، یہود بیشک حجاز میں بکثرت تھے مگر کیا اُنکے پاس آپ آتے جاتے تھے؟ اس کا ثبوت نہیں ملتا، قصص انبیاء، اور احکام و قوانین کی بابت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز محض نقل و حکایت نہیں ہے۔ ہر اہم مسئلہ کے مختلف فیہ مقامات کو یہود و نصاریٰ کے روبرو اس طرح پیش کیا گیا کہ آجتک اُنکا کوئی فریق تردید نہیں کر سکتا۔ جس اشتباہ و اختلاف و لغویات میں وہ مبتلا تھے اُس کو واضح طور پر بتا دیا۔ اُنکے تار و پود بکھیر دئے۔ یہ کام محض برائے نام دو چار مرتبہ کسی یہودی یا عیسائی سے ملاقات کرنے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا کاش یہ لوگ اسی نظریہ کو پیش کرتے کہ آپ پڑھے لکھے تھے، اور محض برائے نام ان پڑھ ظاہر کیا گیا۔ اس صورت میں یہ تمام دعوے درست ہو سکتے تھے۔ الغرض آپکی زندگی کو اگر نقد و تدبر سے دیکھا جائے تو الہام و وحی کے تسلیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں نظر آتا۔ واللہ یہدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

وساری ہیں، ابتدائی جذبات میں اور اس حصے میں جو بعد کو بڑھایا گیا ہے امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ محمد (صلعم) کو خمیر یہود سے نہیں ملا بلکہ انہوں نے بعد کو آٹا فراہم کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت بھی صحیح طور پر اسلام کا ماخذ نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ عیسائیت سے یہاں مراد اس کی وہ ترقی یافتہ صورتیں ہیں جنکا ثبوت تاریخ سے ملتا ہے۔ عرب، یونانی، شامی اور حبشی۔ حمیری کلیسا سے واقف تھے اور انہوں نے طرح طرح سے اسلام پر اثر ڈالا ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی یوم جزا کا خیال اسوقت تک مرکزی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور یہ احساس کہ زندگی پر ایک اعلیٰ حقیقت کی حکومت ہونی چاہئے۔ دینیات کے آثار چڑھاؤ میں فنا ہو چکا تھا مگر شامی، بابلی صحراءیں کلیسا کے مجموعی اصلاحی حلقے سے بہت دور، قدیم عیسائیت اور غالباً اسنزم بھی اتبک ٹمٹما رہے تھے اور کلیسائی تاریخ کا ہاتھ ان تک نہیں پہنچا تھا۔ ان میں سے ایک طرف تو صابی (غطسی) "از ہر" تھے اور دوسری طرف اس خطے کے بے شمار تارک الدنیا صابیوں سے اسلام کا تعلق اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ اور طائف میں اس کے پیرو صابی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان سے عام طور پر صرف خارجی شکلیں اخذ کی گئی ہیں اگرچہ ان کی اہمیت بھی کسی طرح سے نظرانداز نہیں کیجا سکتی ہے۔ سب سے گہرا اثر حنفا پر اور انکے واسطے سے رسول عربی پر بظاہر انہی تارک الدنیا زاہدوں کا پڑا ہے۔ یہ لوگ عرب میں جس قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اسکا اندازہ بدوی شاعری سے ہو سکتا ہے۔ اور جو طاقت انہیں بت پرستوں تک پر حاصل تھی اس کا ثبوت حیرہ اور غسان کی تاریخ کے متعدد واقعات سے ملتا ہے۔ ابو بکرؓ نے جو احکام ان افواج کے سرداروں کو دئے تھے جو شام کیطرف روانہ کی گئی تھیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب ان زاہدوں اور کلیسائی پادریوں کے جزدی فرق سے بھی کس قدر واقف تھے۔ یہ اُنکے عقائد نہ تھے جنہوں نے زیادہ اثر کیا بلکہ ان کی اُن پاک زندگیوں کا سچا خلوص جو آنے والی زندگی کی تیاریوں میں اور یوم جزا کی یاد میں صرف ہوتی تھیں اور جو بت پرستوں کی فاسقانہ اور فاجرانہ زندگیوں سے بالکل الگ نظر آتی تھیں۔ ترک دنیا اور غور و فکر یہی دو باتیں حنفاء میں بھی خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ لوگ بھی راہب کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ انجیل کے انہی گمنام شاہدوں نے جن کا ذکر

کلیسا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا، وہ بیج بویا تھا جس سے اسلام کا پودا[51] اگا۔

حدیث بہت پرمعنی انداز میں یہ بیان کرتی ہے کہ کس طرح آخر کار محمد (صلعم) نے اس چیز کا اعلان کیا جو ایک عرصہ سے انکے اندر موجود[52] تھی اور اپنا کام کر رہی تھی یا بالفاظ دیگر کس طرح وہ نبی بنے۔ ایک دفعہ رمضان کے مہینہ میں جبکہ وہ حسب معمول کوہ حرا پر عبادت اور غور و فکر میں مشغول تھے جبریل رات[53] کے

---

[51] ہرچند کہ تمام معلومات کا ذخیرہ اس سے ساکت و صامت ہے، اور دنیا جانتی ہے کہ عیسائی یہودی اور صابی عرب کے متفرق اطراف میں سعی کرتے رہے، حکومت اور ظلم سے بھی اشاعت مذہب اور دین سے منحرف کرنے کی سعی کی گئی مگر اسکا اثر عرب اور خصوصاً نجد و حجاز میں بہت کم ہوا، اور اگر کچھ کسی جگہ ہوا بھی تو برائے نام مذہب تھا، ورنہ انکے اعمال میں دیگر عرب کے اعمال سے ہرگز کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔

عیسائی اور یہودی و دیگر فرقوں کے یہاں نجات، جزا، و سزا، اور توحید کا وہ درس جو قرآن نے دیا ہرگز نہیں پایا جاتا، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عرب کے ان خطوں میں جہاں عام طور پر آمد و رفت نہیں ہوتی تھی کچھ لوگ اس خیال کے موجود تھے تو اسکا کیا ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ان سے یہ عقائد سیکھے۔ اسلام نے کبھی اسکا دعوے نہیں کیا ہے کہ اسکی تعلیمات میں کوئی جدت ہے۔ قرآن تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ وہ اسی "حق" کی تبلیغ کرتا ہے جو ازل سے موجود ہے اور ابد تک رہیگا۔ ہاں یہ البتہ رسول کا دعوے ہے کہ انہیں جو کچھ علم حاصل ہوا ہے وہ کسی انسانی ذریعہ سے نہیں بلکہ بذریعہ وحی براہ راست خدا سے حاصل ہوا ہے اور جبتک صریح واقعات پیش کئے جائیں اس وقت تک اس سے انکار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اہل یورپ کو دراصل یہ دقت اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ وہ وحی کے امکان کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس بحث کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ

[52] اس خیال کی ابتک کوئی تائید و حجت نہیں قائم کی گئی کہ نبوت سے قبل آپ کے دل میں کوئی خاص چیز موجود تھی۔ احادیث میں جسقدر صحیح وقائع و اخبار ہیں سب میں نبوت سے قبل آپ کے کسی خاص دعوے کے حامل ہونے پر کوئی روشنی قطعاً نہیں پڑتی

[53] اس بیان کو ابن اسحاق نے وہب بن کیسان کے واسطہ سے عبید بن عمیر لیثی سے روایت کیا ہے (. . . . .

وقت خواب میں انکے پاس آئے۔ ایک ریشمین نوشتہ ان کے ہاتھ میں تھا اور باوجودیکہ ان کو پڑھنا نہ آتا

تھا انہوں نے انکو مجبور کیا کہ جو کچھ اسمیں لکھا ہوا تھا اسے پڑھیں۔ یہ گویا آسمانی کتاب کے پہلے ٹکڑے کا

نزول تھا جو وحی کے اس سرچشمہ سے آیا تھا جہاں سے موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے انبیا کو بھی انکا حصہ

ملا تھا اور اس طرح محمد (صلعم) بھی نبی پکارے جانے لگے۔ وہ الفاظ جنکے ذریعہ جبریل نے انہیں پڑھنے

کی دعوت دی انکے قلب پر نقش ہو گئے اور وہ سورہ نمبر ۹۶ کے ابتدائی الفاظ تھے:- اقرء باسم ربک الذی

خلق ہ خلق الانسان من علق ہ اقرء وربک الاکرم ہ الذی علم بالقلم ہ علم الانسان مالم یعلم ہ کلا ان

الانسان لیطغیٰ ہ ان رآہ استغنیٰ ہ ان الی ربک الرجعیٰ ہ[۵۱]

جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے یہ محمد (صلعم) کے علم کی ابتدا نہیں ہے بلکہ انکی نبوت کی یہ یقینی ہے کہ

انکی بنا ایک خواب پر ہے جو انہیں ماہ رمضان کی ایک رات میں نظر آیا تھا (سورہ ۹۷ - اورسورۃ ۱۸۱:۲)[۵۲]

اور یہ ممکن ہے کہ خواب کی شکل اُس تخیل کا نتیجہ ہو جو روایتاً وحی اور نبوت کے متعلق چلا آتا تھا اور جسے

قبول کرنا محمد (صلعم) نے سیکھ لیا تھا[۵۳] یہ البتہ مشتبہ ہے کہ وہ الفاظ جن سے فرشتے نے رسول کو پکارا تھا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۷) (دیکھو سیرۃ ابن ہشام ج ۱ مع الروض صفحہ ۱۵۳) یہ روایت مرسل ہے، اور اس سے اگر کوئی

استدلال کیا جائے تو حدیث صحیحین کے ماتحت اس طرح ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے وحی بصورت

خواب آئی۔ وحی کے ابتدائی سلسلہ میں خواب کا ذکر متعدد روایتوں میں ہے مگر سورہ اقرار کا خواب میں آنا صحیحین

کی حدیث کے خلاف ہے۔ جس میں حضرت جبرئیل کا صاف طور پر آنا بیان کیا گیا ہے (دیکھو صحیح بخاری باب بدا الوحی وغیرہ)

پس اس روایت میں نیند کا ذکر غلط سمجھنا چاہئے۔

[۵۱] آخری تین آیتوں کا نزول اسوقت نہیں ہوا تھا بلکہ بعد کو ہوا۔

[۵۲] یہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۱ نہیں ہے بلکہ آیت نمبر ۱۸۵ ہے یعنی شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔

[۵۳] یقینی ہونیکا دعوے محض خیالی دھوکا ہے۔ جن آیتوں کا حوالہ دیا ہے ان میں خواب کا ذکر نہیں ہے صرف وحی

کا رات میں ہونا مذکور ہے۔ اس سے زیادہ اگر کوئی بات ہے تو وہ تعیین ماہ رمضان پس ایسی . . . .

واقعی وہی ہیں جو سورہ نمبر ۹۶ میں موجود ہیں یا نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ سورۃ بہت پرانی ہے اور اس کے مضامین اسلام کے ابتدائی خیالات کا بہترین نمونہ ہیں۔ انسان اپنے آپ سے مطمئن بیٹھا رہتا ہے لیکن اسے ایک نہ ایک دن اپنے خالق اور مالک کے یہاں لوٹنا ہے اور اس کے روبرو حساب دینا ہے۔ یہ ایک طرح پر قدیم ترین اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

جب فرشتہ چلا گیا تو محمد (صلعم) خدیجہ کے پاس آئے، اور بہت دکھ بھری آواز میں انہیں تمام واقعات سنائے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں آسیب ہو گیا ہے۔ خدیجہؓ نے انہیں بہت تسکین دی اور

(نوٹ صفحہ ۱۸) آیتوں سے خواب کا یقینی ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس مرسل غیر متصل روایت کی بنا پر جو ابن اسحاق نے ذکر کی ہے اس خیال کی عمارت قائم کی گئی ہے جو خود قابل حجت نہیں پھر صحیح صریح حدیثوں کے خلاف ہے۔

رہا وحی و نبوت کے متعلق تخیل، اور آپ کا اسے پہلے سے سیکھ لینا یہ امور خرافات اور لغویات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ نہ ان کا کسی صحیح طریقہ سے ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی زندگی کے متعلق روایتوں کے علاوہ قرآن مجید میں جو کچھ بیان ہے وہ نہایت صاف و صریح الفاظ میں ان تمام باتوں کا رد و ابطال ہے، آیہ ۷۔ سورہ ۹۳ ووجدک ضالاً فھدی، میں آپ کا امور شریعت سے ناواقف ہونا بالتصریح مذکور ہے۔ اسی طرح ۴۲ - ۵۲ وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا، ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا، وانک لتھدی الی صراط مستقیم۔ اسی مضمون کی مزید توضیح ہے۔ سورہ ۲۸، آیہ ۸۶ میں صاف مذکور ہے وماکنت ترجوا ان یلقی الیک الکتاب الا رحمۃ من ربک، فلا تکونن ظھیرا للکافرین، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز اس قسم کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے، نہ کوئی امید کہ آپ نبی ہوں گے۔ اس قسم کی بعض روایتیں اگر کتب سیر وغیرہ میں ہیں تو وہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔

یقین دلایا کہ یہ وحی[ملا] آئی تھی اور اب وہ خدا کے رسول ہیں۔ لیکن انہیں اسوقت پھر شبہات پیدا ہونے لگے جب وحی رک گئی اور یہ شبہات آخر کار بہت تکلیف پہنچانے لگے اکثر ان کے جی میں آتا تھا کہ کوہ حرا کی چوٹی سے گر کر جان دیدیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دماغی تکلیف کی مدت دو سال سے تین سال تک تھی، لیکن فرشتہ پھر یکبیک ظاہر ہوا۔ محمد (صلعم) بہت گھبرائے ہوئے خدیجہ کے پاس آئے اور ان سے کہا "مجھے اڑھاو۔ مجھے اڑھاو" یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اڑھائے جانے کے بعد ہی ان پر غشی طاری ہو گئی اور اسی حالت میں وحی کا نزول ہوا۔ اس کے بعد بھی اکثر وحی اسی قسم کے دورے[ملا]

[ملا] یہ غلط ہے کہ خدیجہؓ نے انہیں یقین دلایا، اس لئے کہ خدیجہ ہرگز ایسا نہ جانتی تھیں، اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ جب واپس تشریف لائے تو پریشان تھے، بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسکین دی کہ آپ سچے، نیک، فیاض اور خادم خلق ہیں، آپ کو ہرگز کسی قسم کا گزند نہیں پہنچ سکتا، اور میں اپنے چچیرے بھائی ورقہ سے اسکا ذکر کرونگی چنانچہ انہوں نے اسکا ذکر کیا اور آپ کو بھی انکے پاس لے گئیں۔ تب وہ بولے کہ اگر یہ سچ ہے تو یہ وہی راز دار فرشتہ آیا ہے جو موسیٰ پر اترا تھا، کاش میں اسوقت زندہ ہوتا جب تمہاری قوم تمہیں شہر بدر کرے گی۔ آپنے فرمایا کیا مجھے یہ لوگ نکالدیں گے؟ وہ بولا بیشک جب اللہ کا نبی حق لیکر آیا تو اس کی قوم نے دشمنی کی، اور اسے ستایا، وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، یہ روایت تمام کتب سیر اور صحیح بخاری و مسلم میں ہے۔

[ملا] وحی کے متعلق اکثر اس قسم کے دوروں کا ہونا محض خیال ہے، خصوصاً یہودی و عیسائی مشنریوں نے اسے صرع بتا کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (معاذاللہ) اس مرض میں مبتلا تھے اور صرع کے بیمار کو جیسے دورے آتے ہیں اسی طرح وحی بھی اُن دوروں کا نام ہے۔ وحی کی یہ کیفیت اول تو کسی طرح صحیح روایت میں نہیں آئی، دوم یہ کہ صرع کے بیمار کا حال دنیا جانتی ہے کہ وہ مضمحل پست ہمت ہوتا ہے اور کسی اعلیٰ کام کا اہل نہیں ہوتا اور بہت جلد یا کچھ وقفہ سے اسی میں مرجاتا ہے، سوم یہ کہ کسی معقول ذریعہ سے آپ کے اس قسم کے مریض ہونیکا پتہ نہیں چلتا، نہ مدینہ کی زندگی میں جو ہزاروں آدمیوں کی آمد و رفت اور منافقین و یہود کا مرکز تھا۔ اس قسم کا ذکر آیا۔

کے وقت آتی تھی۔ اور سورہ نمبر ۷۴، اتری جس کی ابتدا "یاایہا المدثر" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر کوئی فترہ نہیں ہوا اور نہ کسی قسم کا شبہ ہی پیدا ہوا وحی بغیر کسی رکاوٹ کے آتی رہی اور رسول کو اپنی رسالت کا بالکل یقین ہو گیا۔

یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ اس یقین سے پہلے محمد (صلعم) کے دل میں بہت سے شبہات پیدا ہوئے ہونگے اور بہت دماغی تکلیف اٹھانی پڑی ہو گی (سورۃ ۹۳: ۳) لیکن یہ باضابطہ اعتقاد کہ پہلی اور دوسری وحی کے درمیان دو یا تین برس کا فترہ یا وقفہ تھا بعد کی روایات پر مبنی معلوم ہوتا ہے[۵۱]۔ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت اس بحث کے تصفیہ کے لئے بنائی گئی ہے کہ رسول کا قیام مکہ میں دس برس تک رہا یا بارہ برس تک غالباً ایک دوسری دقت کے حل کرنے کے لئے بھی اس کی ضرورت تھی وہ یہ کہ سب سے پہلے سورۃ نمبر ۷۴، نازل ہوئی یا نمبر ۹۶۔ ایک طرح یہ روایت دونوں فریق کے دعووں کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس روایت پر اس واقعہ کا بھی اثر پڑا ہو کہ محمد (صلعم) نے اپنی نبوت کے شروع کے تین سال میں علانیہ تبلیغ نہیں کی بلکہ اپنے نج کے حلقوں میں خدا اور رسول کے راستے کے لئے جانبازوں کی تلاش میں رہے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے گھر کے لوگوں کو ہموار کیا۔ انکی بیوی خدیجہ، انکے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ، ان کے چچیرے بھائی علیؓ (جن کی کفالت کا بار انھوں نے غریب اور کثیر الاولاد ابوطالب

---

[۵۱] اس بات میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث صحیحین وغیرہ میں مذکور ہے جس میں اقرأ کے نزول کی بالتفصیل توضیح ہے بعض کا خیال تھا کہ سورہ مدثر سب سے پہلے اتری، مگر جس حدیث سے انکا استدلال ہے اُسمیں اسکا بھی ذکر ہے کہ وہ فرشتہ جو حرا میں آپ کے پاس آیا تھا پھر آیا اور اس نے یاایہا المدثر پڑھائی یہ جابر کی روایت ہے، ہر دو روایتوں میں فترہ کا ذکر ہے، مگر تعداد ایام و سال مذکور نہیں بعض میں آیا نا کہا، دیگر کتب سیر وغیرہ میں انکی متفرق تعداد مذکور ہے جس کی بابت قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔
رہا آپ کی اقامت مکہ کے لئے اسے بنانا یا کسی اور دقت کے حل کے لئے سو یہ محض خیالات ہیں۔ ان کو اسلئے نہیں بنایا گیا بلکہ بعض نے ان سے استدلال کیا ہے، جسے عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

کے سر سے ہٹا کر خود اٹھا لیا تھا) اور آخر میں انکے سب سے بڑے دوست ابو بکر بن ابی قحافہ۔ یہ لوگ پہلے
مسلمان تھے۔ ابو بکر کی کوشش سے محمدؐ کو چند اور پیرو ملے مثلاً عثمان بن عفان، زبیر بن العوام عبدالرحمن
بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ جو سب کے سب تاریخ اسلام میں نمایاں حیثیت رکھتے
ہیں۔ بہت جلد ایک چھوٹی سی جماعت ہو گئی جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر عبادت کیا
کرتے تھے۔

حنفاء سے اور خصوصاً زید بن عمرو کے خاندان سے ان لوگوں کے تعلقات دوستانہ تھے
دونوں کے نام مشترک تھے یعنی مسلم اور بمشکل کوئی ایسا اصولی فرق دونوں میں تھا جو ایک کو دوسرے
سے جدا کر سکے۔ رسول کی شخصیت نے ایک ایسی تحریک میں جو پہلے سے موجود تھی نئی جان ڈال دی تھی
اور بس۔ کسی طرح محمد (صلعم) کا ارادہ کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالنا نہ تھا۔ وہ صرف یہی چاہتے تھے کہ
اپنی قوم سے قدیم اور سچے دین کو منوالیں۔ وہ عرب کو اسی طرح دعوت حق دیتے تھے جس طرح موسٰے نے
یہود کو دی تھی اور عیسٰی نے نصاریٰ کو۔ یہ سب کا سب ایک ہی دین تھا جو صحیفۂ آسمانی میں لکھا ہوا تھا۔
مختلف کتابی مذاہب کا فرق محمدؐ کو بہت دنوں تک محسوس نہیں ہوا تھا۔

سلہ ۵۷ حنفاء کے ساتھ آپ کا خاص تعلق علاوہ خاندانی عام تعلق کے کسی صحیح ذریعہ سے ثابت نہیں ہو سکا۔ جس طرح عام
لوگ اُن سے واقف، اُنکے بعض خیالات سے آشنا تھے آپ بھی ہوں گے۔ مگر یہ لوگ ایک شک وشبہ کی
صورت میں زندگی گذارتے تھے، انکے پاس زندگی کے ہر پہلو پر کوئی خاص احکام و معلومات کا سلسلہ نہ تھا۔
وہ عام طور پر تبلیغ نہ کرتے تھے بلکہ اپنی زندگی کو راہبانہ زندگی کر کے اسی پر قانع تھے۔ اگر قوم کی سیادت انہیں سے
کسی کے پاس تھی بھی تو وہ یہ تکلیف نہیں کرتا تھا کہ اپنی قوم کی بت پرستی کو مٹائے۔
آپ نے مثل اور انبیاء (موسیٰ عیسیٰ، ابراہیم، نوح، صالح، ہود) اپنی تعلیم کی ابتداء وہی اصل الاصول توحید
سے کی، اسمیں تمام انبیاء مشترک ہیں۔ فروع میں کچھ اختلاف ہے (۸۷-۱۸، ۱۹) اِنَّ ہٰذا لَفِی الصُّحُفِ الاُولیٰ ۵
صُحُفِ ابراہیم وموسیٰ ۵ سے مضمون نگار کا یہ خیال خام قائم کر لینا کہ مختلف کتابی مذاہب کا . . . .

یہ سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے کہ محمد (صلعم) نے کیوں پہلے پہل انہیں لوگوں کی طرف توجہ کی جن تک وہ آسانی سے پہنچ سکتے تھے لیکن انکا کام کچھ اس طرح کا واقع ہوا تھا کہ وہ اسی پر بس نہیں کر سکتے تھے بلکہ اعلان حق کرنا انکا فرض تھا۔ انکے ایک پیرو ارقم بن ابی ارقم نے اپنا گھر جو کعبہ سے بالکل متصل تھا اسی غرض کے لئے پیش کیا۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک معقول جگہ مل بیٹھنے کی شہر کے اندر دستیاب ہوگئی اور کھنڈروں یا غاروں میں مجبوراً جمع ہونے سے نجات ملی۔ یہیں محمد (صلعم) تبلیغ کیا کرتے تھے اور یہاں پر بھی انہیں کچھ اور نئے مسلمان ہاتھ آئے۔ لیکن مکہ والوں میں انہیں کچھ بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جو کچھ یہ کہتے تھے اہل مکہ کم از کم اس کے مفہوم سے پہلے سے ہی آگاہ تھے[۱]۔ نیا صرف وہ ولولہ اور جوش تھا جس سے وہ پرانی سچائی کا اعلان کرتے تھے۔ لیکن اس جوش و خروش کا انپر مطلق اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے انکو کاہن شاعر اور مجنون کہکر ٹال دیا۔ اُنکے خیال میں محمد (صلعم) کے مذہب میں بہت بڑی کمزوری یہ تھی کہ انکے ماننے والے زیادہ تر غلام یا کم حیثیت لوگ تھے اور اکثر نوجوان تھے۔ اگر کوئی حاکم، امیر یا مُسن آدمی انکا ساتھ دیتا تو بالکل دوسری بات تھی۔ یہ حالت خود رسول پر بھی بہت گراں گذرتی تھی۔ سورۃ نمبر ۸۰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپکو اس امر پر تنبیہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳) فرق محمد کو بہت دنوں تک محسوس نہیں ہوا تھا،، درست نہیں ہے کیونکہ یہ دعوے آپ کا آخر تک رہا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اسلام،، ہی صرف تمام انبیا کا دین ہے، یعنی اصول اسلام جو توحید اور عبادت الٰہی کے سوا کچھ نہیں تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اسی کی تعلیم سب دیتے آئے، اور اسی کو آپنے مکمل فرماکر تمام شبہات کے راستے بند کر دئے۔

[۱] یہ خیال غلط ہے کہ اہل مکہ پہلے سے اُس سے آگاہ تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام نزاع کا خاتمہ ہوجاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل مکہ اضطراری حالت میں صرف اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، ورنہ سیکڑوں واسطے اور وسیلے بنا رکھے تھے جنہیں اپنا الٰہ مان رکھا تھا حشر و نشر کے منکر تھے، نذر و نیاز اور تمام عبادتیں غیر اللہ کیلئے مخصوص تھیں، یا غیر اللہ کی شرکت انیں لازمی تھی۔ ان امور کی تعلیم یا انکی بابت انکے پاس کوئی علم نہ تھا۔ ورنہ وہ یہ کہتے کہ ہم اسے پہلے سے سنتے آئے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں

کی گئی ہے کہ انہوں نے ایک اندھے فقیر کو بہت رکھائی سے الگ کر دیا تھا اس لئے کہ اس بیچارے نے انہیں اسوقت ٹوک دیا تھا جب وہ ایک با اثر آدمی کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے تھے حالانکہ اپنی کوشش میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔

اہل مکہ کی اس بے نیازی نے رسول خدا کے الفاظ میں بہت تلخی پیدا کر دی اور اب ان کے مواعظ میں ایک ایسا اختلافی رنگ جھلکنے لگا جو پہلے نہ تھا۔ ابتدائی سورتوں میں ہمیں توحید اثباتی اور عملی شکل میں نظر آتی ہے۔ خدا قادر مطلق ہے اور علیم و دانا۔ وہ انسان سے وفاداری، تزکیہ نفس اور غیر مشروط اطاعت کا طالب ہو۔ جو عمل اس کے یہاں مقبول ہے وہ سچی زندگی ہے ایسی زندگی جس کی امتیازی خصوصیات نماز، روزہ اور زکوٰۃ ہو۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہو کہ اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی اطاعت ان خیالات سے خارج ہے۔ لیکن یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ اس توحید کا شدید انکاری رنگ رفتہ رفتہ کھلا۔ یہ اسی بے توجہی اور استہزاء کا باعث تھا کہ محمد (صلعم) نے پہلی بار شرک کی سختی سے مخالفت شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی رسالت پر زیادہ زور دیا محض اس لئے کہ لوگ اُسے ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب وہ کفار کو انکے اس عمل پر کہ وہ حکم خدا اور رسول خدا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے سخت عذاب کی دھمکی دینے لگے۔ اُنہوں نے ان اقوام ماضیہ کا ذکر کرنا شروع کیا جن پر اس وجہ سے قہر خداوندی نازل ہوا تھا کہ وہ اپنے نبی کی بات نہ سنتے تھے اور اس موقع پر وہ پرانے قصوں کو موجودہ حالات پر اس طرح منطبق کرتے تھے کہ نتیجہ نکالنے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ یہ اہل مکہ کی ناراضگی کا باعث ہوا اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ بالآخر یہ نیا مذہب آہستہ آہستہ پھیلنے بھی لگا۔ جن چیزوں کو محمد (صلعم) برا بھلا کہتے تھے وہ انکے لئے مقدس تھیں وہ اپنے معبودوں اور اپنے آبا و اجداد کی حمایت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انکا تعلق آبائی طریقہ عبادت سے اس وجہ سے اور گہرا تھا کہ ان کے شہر کی تمام ترقی کا دار و مدار اسی پر تھا۔ اب تک انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کعبہ شرک کا مرکز نہیں ہو بلکہ خدا کا گھر ہے[1]۔ لیکن ان کے لئے

---

[1] اس بیان سے مضمون نگار کا مقصود یہ ہو کہ آپنے شروع شروع میں تمام بتوں کی برائی کے ساتھ (......

کوئی اور صورت اس کے سوا نہ تھی کہ وہ ابوطالب کے پاس جو رسول کے چچا اور انکے خاندان کے سردار تھے جاتے اور ان سے کہتے کہ انہیں چپ کرائیں یا پھر ان سے اپنا سایہ حمایت اٹھالیں۔ ابوطالب، محمد (صلعم) کے مذہب کی حقانیت کے خود قائل تو نہ تھے مگر وہ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ انپر محض اس لئے کہ وہ انکی حمایت میں ہیں خواہ مخواہ پابندیاں عائد کردیں۔ بالآخر جب اہل مکہ نے سختی سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ یا تو ابوطالب اپنے بھتیجے کے ان ناروا حملوں کو روکیں یا علانیہ انکی حمایت کریں اور سب کے خلاف میدان میں آجائیں تو مجبوراً انہوں نے محمد (صلعم) کو بلایا۔ انکے سامنے صورت حالات پیش کی اور ان سے یہ درخواست کی کہ خود اپنے آپ کو بھی اور ان کو بھی تباہی میں نہ ڈالیں۔ محمد (صلعم) پر اس تقریر کا بہت اثر ہوا اور انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ انکے چچا ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ تو کسی طرح بھی اعلان حق کی اس ذمہ داری سے جو خدا کی عائد کی ہوئی تھی الگ نہ ہوسکتے تھے اس لئے انہوں نے یہ جواب دیا "اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند رکھدیں تب بھی میں اسوقت تک باز نہ آؤنگا جبتک یا تو خدا مجھے کامیابی عطا کرے یا اس کی راہ میں میری جان چلی جائے" ان الفاظ کے ساتھ محمد (صلعم) آبدیدہ ہوگئے اور واپس ہونے کے لئے مڑے۔ لیکن ابوطالب نے انہیں پکارا اور یوں کہا "اے میرے بھائی کے فرزند! جاؤ جو تمہارا جی چاہے کہو۔ میں تمہیں کسی حالت میں بھی چھوڑ نہیں سکتا۔"

باوجود ابوطالب کی حمایت کے بھی محمد (صلعم) کو ان ذلتوں سے نجات نہیں ملی جو انہیں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں روز برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ کوئی انکو بہت زیادہ تکلیف

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴) خود خانہ کعبہ کی بھی برائی کی، یا کم از کم اسکا ذکر نہیں کیا جس سے سمجھنے والے یہی سمجھے کہ یہ بھی منجملہ مقامات شرک، دو اکز کفر ہے، مگر اس دعوے کے خلاف قرآن مجید کی تمام مکی سورتیں بآنگ دہل اعلان کرتی ہیں کہ خانہ کعبہ ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا، جو موحد بت شکن تھے، انہوں نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے شرک و بت پرستی سے اجتناب کی دعا کی تھی، سورۂ انعام، سورۂ ابراہیم وغیرہ میں یہ باتیں بالتفصیل مذکور

نہیں پہنچا سکتا تھا اس لئے کہ وہ خونریزی جو اسکا لازمی نتیجہ ہوتی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن ان سے کہیں زیادہ تکلیف میں انکے وہ ساتھی تھے جو کسی اور کے ماتحت تھے یا جنکی پشت پناہی کے لئے کوئی طاقتور خاندان نہ تھا بالخصوص وہ غلام یا کنیزیں جنہوں نے یہ نیا مذہب اختیار کر لیا تھا انکے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوتی تھی بلکہ اکثر اوقات شدید بے رحمی کا نشانہ بنتے تھے۔ ان میں سے بعض کی آزادی کی قیمت ابو بکر نے ادا کی۔ اگرچہ اسکا پتہ نہیں چلتا کہ کوئی شہید ہوا ہو[۱] لیکن پھر بھی بہت سے مسلمانوں کی حالت ایسی ناقابل برداشت ہو گئی کہ انہیں مجبوراً حبشہ کیطرف ہجرت کرنی پڑی۔ حبشہ کے عیسائیوں کو یہ لوگ تقریباً اپنے مذہبی بھائی کے برابر سمجھتے تھے۔

ایک عرب کے لئے اپنی قوم کی دشمنی گویا تمام دنیا اور خدا سے دشمنی مول لینا ہے وہ اس کو کسی طرح موت سے کم نہیں سمجھتا۔ محمد (صلعم) جو اب تک مکہ میں ہی مقیم تھے۔ طبعاً اس دشمنی کو کم کرنیکی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے اور انکے ہم وطن بھی قدرتاً یہی چاہتے ہونگے کہ ان سے کوئی سمجھوتہ کرلیں۔ محمد (صلعم) نے اس کوشش میں یہانتک کیا کہ اپنی توحید کی تیز دھار کو کچھ کند بھی کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ جب سرداران قریش کعبہ میں جمع تھے محمد (صلعم) انکے پاس آئے اور انکو سورہ نمبر ۵۳ سنانے لگے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے :۔ افرایتم اللات والعزی، ومنوۃ الثالثۃ الاخرے، تو شیطان نے انکی زبان پر وہ الفاظ جاری کر دئے جنہیں وہ ایک مدت سے بذریعہ وحی کے حاصل کرنا چاہتے تھے[۲]۔ وہ الفاظ یہ ہیں تلک الغرانیق العلے وان شفاعتھن لترجی سننے والے بہت متعجب

---

[۱] حضرت عمار کی والدہ سمیہ کو ابوجہل نے مار ڈالا تھا۔ (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۲۰۳)

[۲] اسمیں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دل سے چاہتے تھے کہ کسی صورت سے سب اہل مکہ اسلام کو قبول کریں۔ انکے کفر و شرک سے اسلام کی عداوت اور مسلمانوں کی ایذا سے سخت رنجیدہ ہوتے تھے، یہ مضمون چند سورتوں میں وارد ہے منجملہ انکے سورۂ کہف کی ابتدا میں صاف طور پر مذکور ہے فلعلک باخع نفسک علے آثارہم۔ ان لم یومنوا بہذا الحدیث اسفا، اس ذیل میں یہانتک بھی مذکور ہے کہ آپ کسی قسم کے ا

ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ خوش بھی ہوئے کہ اُنکی دیویوں کو محمد (صلعم) نے تسلیم کرلیا۔ چنانچہ جب انہوں نے

(نوٹ صفحہ ۲۶) سمجھوتہ کے لئے بھی راضی ہو گئے تھے یا قریب برضی تھے، یعنی یہ کہ ایک معین عرصہ تک آپ بتوں کی مذمت سے سکوت اختیار کریں، اور کفار بھی مسلمانوں کی ایذارسانی سے باز آجائیں ۶۸-۹ وَدُّوا لَوْ تُدْہِنُ فَیُدْہِنُوْنَ ۝ اور (۱۷-۷۳،۷۴،۷۵) وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذاً لاتخذوک خلیلا ۝ ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیہم شیئاً قلیلا ۝ اذاً لاذقناک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لاتجد لک علینا نصیرا ۝

ان آیات سے آپ کا اتحاد وائتلاف کے لئے بشریت سے میلان ظاہر ہوتا ہے، مگر اس کا واقع ہونا کسی صحیح ذریعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ "تلک الغرانیق العلیٰ" کا افسانہ باوجود شہرت کے بے سند اور بے اصل ہے، کسی صحیح روایت سے نہ ثابت ہے نہ صحیح حدیثوں کے کسی مجموعہ میں اسکا ذکر ہے، سب سے اول اسے زہری نے اپنی مغازی میں بلاسند ذکر کیا ہے، جس کے بعد یہ قصہ تمام مغازی وسیر کی کتابوں میں اسی واحد ذریعہ سے شائع ہوا، علماء ناقدین، محدثین محققین نے اس کو بے اصل اور موضوع بتایا۔ پھر اسکی مختلف طور پر روایتیں ہیں، کسی میں یہ الفاظ آپ نے خود پڑھے، کسی میں شیطان نے پڑھے، کسی میں یہ ہے کہ خود مشرکین نے آپ کے پڑھنے سے پہلے پڑھے، غرض کوئی صحیح بیان نہیں ہو سکا۔ مخالفین جو ضعیف کو صحیح اور صحیح کو ضعیف بنانیکے واسطے ہر وقت تیار رہتے ہیں اسے لے اڑے اور زنگارنگ سے اسے چمکا دیا، اس مسئلہ میں بعض مسلمانوں کو بھی شبہ ہو گیا ہے وہ ملحدین وزنادقہ کے دام فریب میں آکر اس قسم کی روایتوں کو قبول کرنے پر مائل ہوئے ہیں، بعض نے آیۃ ۵۲، ۵۳، ۵۴ سورہ الحج (۲۲) وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ واللہ علیم حکیم ۝

سے استدلال کیا ہے حالانکہ اُمنیت (آرزو) اور قرأت دونوں ایک چیز نہیں، نبی بشریت سے بعض ایسی آرزوئیں کرسکتا ہے جو خلاف مرضی الٰہی ہو، مگر وہ قرأت میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا گھٹا نہیں سکتا چنانچہ (۶۹-۴۴ تا ۴۷) ولو تقول علینا بعض الاقاویل ۝ لاخذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین

اس سورہ کو ان الفاظ پر ختم کیا : فاسجدوا للّٰہ واعبدوا تو وہ سب کے سب ایک ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ اس کے بعد انہوں نے اس اقرار پر اظہار اطمینان کیا اور محمد (صلعم) کو ماننے کے لئے تیار ہو گئے لیکن رسول خدا گھر پریشان واپس گئے۔ شام کو جب جبرئیل آئے تو محمد (صلعم) نے یہ سورۃ انکے سامنے دہرائی۔ اسے سنکر فرشتے نے کہا ارے یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے لوگوں کو وہ الفاظ سنائے جو

فما منکم من احد عنہ حاجزین . . . . میں صاف مذکور ہے کہ نبی کسی طرح سے کوئی الفاظ بڑھا گھٹا نہیں سکتا۔ ورنہ وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا اور (۷۲-۲۷، ۲۸) میں حفاظت کا ذکر ہے، اور یہ کہ خدا کے علم و حفاظت کے ذیل وحی اُترتی ہے، اگر اس قسم کے شیطانی وساوس کا دخل اسمیں ہو جائے تو پھر حفاظت الٰہی بیکار ہو، اور وحی الٰہی و وحی شیطانی میں تمیز کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

رہا بعض روایتوں میں اس امر کا بیان کہ آپ کے سجدے کے وقت تمام کفار نے سجدہ کیا، یہ غالباً بہت پہلے کا واقعہ ہے، یعنی ہجرت حبشہ سے بھی پہلے کا چنانچہ ابن مسعود وغیرہ کی روایت اس پر شاہد ہے، گویا اُسوقت کفار و مسلمین میں ایسی منافرت نہ تھی، اور ہو سکتا ہے اگر اس کی صحت ثابت ہو کہ حبشہ والوں کو ایذا، اور تکلیف دینے کے واسطے کفار قریش نے یہ حرکت کی ہو، اور اسے شائع کر کے انہیں واپس کیا ہو، کیونکہ انہوں نے نجاشی کے پاس اپنے سفیر بھیجکر انکی واپسی پر زور دیا تھا مگر اُس نے قبول نہ کیا، اور بجائے اس کے کہ ان پر کسی قسم کی سختی کرتا اور زیادہ مہربان ہوا، وہ خود مسلمان ہوا، اور ایک جماعت اسکے ساتھ مسلمان ہوئی، بعض علماء نے یہ صورت بھی بیان کی ہے کہ ممکن ہے آپ نے پڑھتے پڑھتے وقفہ کیا ہو اور اُسی وقت شیطان نے یہ الفاظ "تلک الغرانیق العلیٰ" پڑھ دئیے ہوں، مگر یہ بھی کسی طرح قابل قبول نہیں، اس لئے کہ یہ روایت پایہ ثبوت کو نہیں پہونچی پھر حفاظت وحی کے بھی صریح خلاف ہے۔

غرض یہ قصہ منجملہ ان بے حقیقت و بے اصل قصوں کے ہے جسے اعداء دین نے شائع کیا، اور بہت سے بھولے بھالے لوگوں نے محض عجیب و غریب ہونیکی وجہ سے قبول کر کے اپنی کتابوں میں درج کر دیا، جس طرح اور رطب و یابس روایتیں وہ درج کرتے تھے۔ جب تحقیق و تنقید کا وقت آیا تو اسے صحیح روایت سے خارج کر دیا گیا۔ پس یہ نہ یقینی ہے، نہ ظنی، بلکہ کذب و افترا ہے اور بس۔

میں نے تم سے ہرگز نہیں کہے تھے،، اب محمد (صلعم) کو اسکا سخت صدمہ ہوا اور یہ خوف ہوا کہ کہیں خدا کی نگاہ سے گر نہ جائیں لیکن انکے رب نے انہیں پھر اپنے سایہ میں لے لیا اور انکا درجہ اور بلند کر دیا۔ اس نے ان کے قلب سے ان شیطانی الفاظ کو مٹا دیا اور صحیح آیت کو نازل کیا۔ اس طرح پوری عبارت اب یوں ہوئی:۔ افرایتم اللات والعزیٰ۔ ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ۔ الکم الذکر ولہ الانثیٰ۔ تلک اذًا قسمۃ ضیزیٰ۔ جب یہ نئے الفاظ اہل مکہ کے کانوں تک پہنچے تو انہوں نے پرانے الفاظ سے انکا مقابلہ کیا اور یہ سمجھ لیا کہ رسول نے پھر صلح ختم کر دی۔ اب انکی دشمنی پھر شروع ہوئی اور زیادہ شد و مد کے ساتھ۔

عام طور پر شبہ کیا جاتا ہے اور یہ حق بجانب ہے کہ یہ سمجھوتہ ایک عارضی وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ گفت و شنید اور طویل غور و فکر کے بعد کیا گیا تھا اس کے علاوہ دوبارہ ان بن بھی اتنی فوری نہ تھی جتنی دکھائی جاتی ہے۔ یہ صلح غالبًا ایکدن سے زیادہ تک قائم رہی۔ کم از کم اس واقعہ میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں۔ ہر مذہب کو عوام کے ہموار کرنے کے لئے ایک نہ ایک سمجھوتے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محمد (صلعم) کے لئے یہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ بعد میں انہوں نے مفاہمت کے اصول پر زیادہ پر اثر طریقہ سے عمل کیا۔

اہل مکہ اور محمد (صلعم) کے درمیان جو صلح ہوئی تھی اس کی خبر پا کر حبشہ کے مہاجرین واپس آگئے[1] لیکن یہاں پہنچکر انہوں نے صورت حالات کو اس سے بہت مختلف پایا جس کی توقع انکو چلتے وقت تھی اور تھوڑے ہی دن بعد دوسری دفعہ ہجرت کرنی پڑی۔ آہستہ آہستہ کوئی ایک سو ایک مسلمان جن میں سے اکثر نوجوان تھے چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں پھر حبشہ کیطرف چلے گئے اور وہاں پھر انکا دوستانہ خیر مقدم

---

[1] یہ واقعہ سراسر غلط ہے کہ آپنے کوئی صلح کی، کیونکہ یہ قرآن مجید و صحیح روایات کے خلاف ہے اس لئے اس رجوع کا معاملہ بھی مشتبہ ہے۔ اگر کوئی صورت ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہی کہ اہل مکہ نے محض مہاجرین مسلمانوں کو واپس بلانے کے واسطے ایسی کوئی حرکت کی ہو۔ اور ممکن ہے کہ بعض مسلمان واپس ہوئے ہوں۔

کیا گیا - انہیں جعفر بن ابی طالب اور رسول کی بیٹی رقیہ بھی مع اپنے شوہر عثمان ابن عفان کے شامل تھیں۔

اس مفاہمت سے یک بیک پھر جانیکی وجہ سے محمد (صلعم) کا اعتبار بہت گھٹ گیا اور خود اُن کی طبیعت بھی عرصے تک اس سے متاثر رہی - اپنی اس لغزش کی یاد سے اگرچہ وہ بہت دنوں تک دبے اور گرے رہے (سورۃ ۱۷، ۵-۷)[ف۱] لیکن اپنی رسالت میں انہیں کسی قسم کا شک نہیں پیدا ہوا اور انکے پیرووں نے بھی اپنے دلوں میں شبہے کو جگہ نہ دی مگر اہل مکہ نے ان کے اس طرز عمل سے کہ پہلے تو انہوں نے ایک آیت کو خدا کی طرف سے لوگوں کو سنایا اور پھر فوراً ہی اسے وسوسۂ شیطانی کہکر واپس لے لیا - بلا پس و پیش یہ نتیجہ نکال لیا کہ نبوت اور وحی کے تمام دعوے اک صریح فریب کے سوا اور کچھ نہیں انکی اس روکھی اور ظالمانہ منطق کا جواب رسول کے پاس بس یہی تھا کہ پورے جوش کے ساتھ انکو یقین دلانے کی کوشش کریں۔

مسلمانوں کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں جبکہ ان کی مختصر سی جماعت کے لئے صورت حالات ایک نازک پہلو اختیار کر رہی تھی دو ایسے اشخاص اسلام لائے جو ان کی ہمت بڑھانے کے لئے بہت موزوں تھے - محمد (صلعم) کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب نے یہ محسوس کیا کہ بنی مخزوم کے مالدار سردار ابو جہل کے ہاتھوں محمدؐ کو جو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے اس سے انکے خاندان کی عظمت پر حرف آتا ہے چنانچہ انکی علانیہ حمایت کی غرض سے انہوں نے اسلام قبول کر لیا - اس سے زیادہ اہم اور مفید اسی سال (یعنی سنہ ۶ نبوی میں) عمرؓ بن الخطاب کا مسلمان ہونا تھا - عمرؓ کا سن اس وقت صرف چھبیس سال

[ف۱] ان آیتوں میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے آپ کے میلان کا ذکر ہے، نہ کسی واقعہ کا پس ان آیتوں سے یہ استنباط کرنا کہ قصہ مذکورہ کے بعد یہ اُسی رنج کے رفع کرنے میں نازل ہوئیں، نہایت غلط استنباط ہے، بلکہ اس میں ایسے معاملہ کی صریح تردید ہے - اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا تو بہت سے نومسلم مرتد ہو جاتے یا کم از کم انہیں شبہ کا موقع ملتا - اسی طرح کفار قریش شور مچاتے اور بقول مضمون نگار روکھی منطق سے کام لیتے مگر ایسا نہ ہوا نہ اسکا کوئی ذکر قرآن مجید میں ہے۔

کاتھا، وہ نہ تو بہت مالدار تھے اور نہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن انکی بارعب شکل وصورت
اور زبردست قوت ارادی نے انکا ایک ذاتی اقتدار قائم کر دیا تھا اور یہ اقتدار انکے مسلمان ہوتے ہی اسلام
کی حفاظت وحمایت میں کھلم کھلا برسرکار نظر آنے لگا۔ ابتک مذہبی اجتماع چھپ چھپ کر بالخصوص ارقم
کے گھر میں ہوا کرتے تھے لیکن عمر نے علانیہ کعبہ میں نماز پڑھنی شروع کی اور دوسروں نے بھی انکی تقلید کی،
اب مسلمانوں کی عبادتیں خفیہ طور پر نہ ہوتی تھیں بلکہ کھلے بندوں اور سب کی آنکھوں کے سامنے۔

جہانتک پتہ چلتا ہے یہی زمانہ تھا جب کہ محمد (صلعم) اور انکے ہم وطنوں کے درمیان دشمنی کی آگ
بہت بھڑک گئی تھی۔ یہ خیال کہ وہ خود کو لوگوں کی نظروں سے گرا چکے ہیں انہیں اور زیادہ تلخی پیدا کر رہا تھا
اور انہوں نے یہ ٹھان لیا تھا کہ اس رعایت کی جو ایک دفعہ وہ شرک کے ساتھ کر چکے تھے تلافی اسی طرح
ہو سکتی ہے کہ اس کے خلاف سخت سے سخت خیالات کا اظہار کریں۔ ایک ذاتی عنصر جو اصولوں کی اس
جنگ میں کبھی کبھی جھلک دکھا دیا کرتا تھا رفتہ رفتہ غالب ہوتا گیا خدا کے نزدیک بتوں سے زیادہ قابل
نفرت بت پرست تھے۔ اسے اسکا زیادہ خیال نہ تھا کہ لوگ اس کی عبادت کریں بلکہ اسکا کہ لوگ اس
کے رسول پر ایمان لائیں[۵۱]۔ بڑھتی ہوئی تصریح کے ساتھ نبی کے کلام میں اہل مکہ کے دھمکانے اور انہیں
برا بھلا کہنے کے سوا اب اور کچھ نہ رہا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ نوح، موسے اور ابراہیم کی تصویروں میں خود
محمد (صلعم) کی صورت نہ پہچانی جائے۔ اہل مکہ پر نازل ہونے والا عذاب یا اس کے نازل ہونے کا وقت
یہی دو موضوع تھے جن پر کھلے یا ڈھکے الفاظ میں "نذیر" کی ساری تقریر کا مدار تھا لیکن جتنی ہی زیادہ
اس کی تکرار کی جاتی تھی اتنا ہی کم اہل مکہ پر اس کا اثر ہوتا تھا۔ انہیں بالکل اس تباہی کا خوف نہ تھا جسکی
تصویر انکے سامنے بہت گہرے رنگ میں کھینچی جاتی تھی اور نہ وہ اس کی طرف التفات کرنیکی تکلیف گوارا

---

۵۱ یہ خیالات اسلام میں قدیم ہیں، نبی کی اطاعت کے بغیر خدا کی مرضی سے انسان واقف نہیں ہو سکتا،
مگر نبی صرف مبلغ کی حیثیت رکھتا ہے اسے الوہیت میں کسی قسم کی شرکت کا دعوے نہیں، نہ کسی قسم کی عبادت
و نذر میں اسکا کوئی حصہ ہے۔ یہ تعلیم ابتدا سے تھی۔ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ اس کی تعلیم کسی پچھلے زمانہ
میں بگڑ گئی محض خیال ہے۔

کرتے تھے بلکہ انکے کفر اور بے دینی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس عذاب کے دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کیا کرتے تھے جن کی ایک مدت سے انکو دھمکی دیجاتی تھی اور انکی جسارت یہانتک بڑھ گئی تھی کہ وہ ان آیتوں کے جن سے محمد (صلعم) انکے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے صبر آزما ہونیکی شکایت کرتے تھے۔انہیں ایسا ذرا سا بھی اسکا یقین نہ تھا کہ انجیل کے وہ قصے جنکو محمد (صلعم) بہت فخر سے سناتے ہیں انہیں وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں بلکہ بخلاف اس کے وہ لوگ یہ دکھانا چاہتے تھے کہ انہیں اس انسانی منبع کا علم ہے جہاں سے وہ یہ باتیں سیکھتے ہیں (سورہ ۱۶-۱۰۵[1] و ۲۵-۵ و ۴۴-۱۳[2]) یہ حقیقت خالی از لطف نہیں کہ اہل مکہ کے انکار اور عدم یقین کے مقابلہ میں محمدؐ کی طرح بنی اسرائیل کی تصدیق اور شہادت کو پیش کرتے ہیں[3] (سورہ ۶-۱۱۴ و ۱۰-۹۴ و ۱۳-۳۶ و ۱۷-۱۰۸ و ۲۸-۵۲ و ۴۳-۶۰) اور خصوصاً ایک

---

[1] یہ سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۰۳ ہے یعنی:۔ ولقد نعلم انهم يقولون انما يعلمه بشر الخ

[2] غالباً سورۂ دخان کی آیۃ نمبر ۱۴ مراد ہے یعنی:۔ ثم تولوا عنه وقالوا معلم مجنون

[3] اہل مکہ کہتے تھے کہ نبی فرشتوں میں سے کوئی کیوں نہ ہوا، نیز نبوت کا انکار کرتے تھے۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ نبی ہمیشہ انسان ہوا کرتا تھا، کبھی فرشتہ نہیں آیا۔ اگر اسمیں شک ہو تو اہل کتاب سے دریافت کرو۔ نبوت کے امور کی بابت بھی جو کچھ شبہات ہوں اہل کتاب سے حل کر سکتے ہو۔ ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۲۳۹ پر ہے کہ حبشہ یا نجران کے عیسائیوں کی ایک جماعت آئی اور وہ مسلمان ہو گئی، جسے کفار مکہ نے برا بھلا کہا۔ یہ ذکر آیۃ ۵۲ تا ۵۵ سورہ قصص (۲۸) میں ہے، سورہ ۴۶، ۹ میں عبداللہ بن سلام اسرائیلی یہودی کا ذکر ہے جو آپ کے مدینہ جانے پر مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے، اسے مکہ کے ذکر سے تعلق نہیں۔ ان تمام باتوں سے آپ کا تعلق یہود سے ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ آپ کا علم یہود و نصاریٰ کی بابت ظاہر ہوتا ہے اور یہ کہ اُن کے پاس کچھ بشارتیں نئے آنے والے کے متعلق ہیں، وہ وحی کی کیفیت، رسول کی صفات سے بخوبی واقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی قسم کے تعلق پر ہرگز روشنی نہیں پڑتی۔

یہودی کی شہادت جس کا نام نہیں لیتے (سورۃ ۴۶-۹) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں
انکے تعلقات یہودیوں سے تھے اور یہ ان کے زیر اثر تھے اور انہیں سے بالتحقیق توراۃ اور ہگادا
کا مسالہ انہیں حاصل ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ انہیں خود اسکا یقین رہا
ہوگا کہ یہ باتیں انکو عالم بالا سے بذریعہ وحی کے معلوم ہوتی ہیں ورنہ وہ مخالفت کے ہوتے ہوئے صرف
یہودیوں کی شہادت پر ہرگز بھروسہ نہ کرتے۔ اسی قسم کا فریب نفس شکل سے ہماری سمجھ میں آسکتا ہے لیکن
یہ کہنا ناممکن ہے کہ رسول عربی میں یہ خطرناک عنصر بالکل موجود نہ تھا[۱۵]۔

اب قریش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انکے سرداروں نے جمع ہو کر یہ عہد کیا کہ ہاشمیوں
سے آئندہ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھیں گے اس لئے کہ وہ محمد کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔ ہاشمیوں نے
اپنے رشتہ دار کی خاطر اس مصیبت کو جھیلنا پسند کیا حالانکہ ان میں سے اکثر ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔
بنو المطلب کے ساتھ وہ سب کے سب شعب ابو طالب میں چلے گئے صرف ان میں سے ایک فرد یعنی ابولہب
علیحدہ ہوگیا اور اہل مکہ سے جا کر مل گیا۔ ہر قسم کا لین دین ان شہر بدر لوگوں سے ممنوع تھا اس لئے

---

۱۵ جس بات کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ رسول ہمیشہ انسان ہوئے ہیں، وحی الٰہی انسانوں پر ہوا کرتی
تھی، اس کے متعلق کسی اہل کتاب کو نہ اس زمانہ میں نہ اب اختلاف کی گنجائش ہے۔ ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۹
میں مذکور ہے کہ اہل مکہ نے اپنے چند آدمی مدینہ بھیجکر یہود سے دریافت کیا تھا کہ کوئی فیصلہ کی بات بتاؤ جس سے محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہمیں معلوم ہو جائے کہ صادق ہیں یا کاذب، انہوں نے کہا کہ یہ تین باتیں دریافت
کرو (اصحاب کہف، مشرق و مغرب میں گھومنے والے کا ذکر، اور روح) اگر وہ انکے جواب دے تو صادق ہے، ورنہ
کاذب، اسکا جواب سورہ کہف و بنی اسرائیل میں دیا گیا، مگر جن طبیعتوں میں ضد اور خبث تھا وہ ایسی باتوں سے مسلمان
کیونکر ہو سکتی تھیں، الغرض اگر آپ کا کوئی خاص تعلق یہود سے ہوتا، یا کوئی انسانی معلم آپکو تعلیم دیتا تو اہل مکہ محض دعوے
پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اسکو اچھی طرح شائع کرتے، ساحر، شاعر، مجنون، کاہن کہنے کی ضرورت نہ تھی، اور ممکن ہے بہت سے
مسلمان اس صورت میں یہودی ہو جاتے جب وہ دیکھتے کہ یہ علم یہود سے حاصل کیا گیا ہے۔

صرف یہی مصیبت نہ تھی کہ یہ لوگ جماعت سے الگ تھے بلکہ با اوقات جسمانی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز عمل کی اگرکبھی پوری سختی سے پابندی نہیں کی گئی مگر پھر بھی یہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا۔ رسول کے وہ پیرو جنکا تعلق ابھی مستحکم نہ ہوا تھا انہیں چھوڑ بیٹھے اور انکی تمام تبلیغی کوششیں یکسر سرد پڑ گئیں[٥١]۔ اب انکا صرف یہی کام رہگیا تھا کہ جو لوگ ابتک وفادار رہگئے ہیں انکا دل بڑھائیں اور اپنے اعزا کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں۔

یہ حالت دو تین سال تک قائم رہی لیکن بالآخر خود اہل مکہ کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی اس لئے کہ انکے تعلقات اس نکالے ہوئے خاندان سے مختلف نوع کے تھے (اور بغیر انکے کام چلنا محال تھا) سنہ ۱۰ نبوی (۶۱۹-۲۰ء) میں اہل مکہ میں سے پانچ ذی اثر اشخاص شعب ابی طالب میں گئے اور بنو ہاشم اور بنو المطلب کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کونے سے نکل کر پھر منظر عام میں آجائیں۔ باقی قریش ان لوگوں کے دفعتاً نمودار ہونے سے کچھ گھبرا سے گئے اور انہیں اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ان با اثر امان دینے والوں کی مخالفت کرکے خواہ مخواہ ایک نئی اور عظیم الشان آفت مول لیں۔ روایت ہے کہ ایک مبارک واقعہ کی وجہ اہل مکہ کی وہ قسم بھی ٹوٹ گئی جو انہوں نے بنی ہاشم کے بارے میں کھائی تھی۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ چوہوں نے اس عہد نامے کو کھا ڈالا تھا جو لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا[٥٢]۔

---

٥١ کسی تاریخ و سیر کی کتاب سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس اثنا میں کچھ مسلمان مرتد ہوگئے اور واقعہ یہ بھی ہے کہ ایسے سخت زمانہ میں بجز کچے سچے مسلمانوں کے کوئی طامع منافق، مسلمان نہ ہوا تھا، جو کسی وجہ مخصوص کے زائل ہونے سے کفر کو قبول کرتا۔ بلکہ جس قدر شدت اور مصیبت پہونچتی تھی وہ اسلام میں اور پختہ ہوتے تھے۔ پس یہ کہنا کہ وہ رسول کے پیرو جنکا تعلق ابھی مستحکم نہ ہوا تھا انہیں چھوڑ بیٹھے" افترا محض اور ادعا باطل ہے آپ کی تبلیغی کوششوں کا یکسر سرد پڑجانا بھی غلط ہے، آپ اپنی سعی میں اسی طرح مصروف رہے جس طرح پہلے تھے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اب چند مخصوص لوگوں سے گفتگو ہوتی تھی۔

٥٢ ابن سعد، ابن ہشام وغیرہ میں دیمک کا نام ہے (ارضہ) اور ساتھ ہی آپ کے پیش گوئی کا ذکر ہے (××)

محمد (صلعم) اب پھر آزاد تھے لیکن انہوں نے نہ تو پھر اہل مکہ کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور نہ ان پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کی کوشش کی۔[1] انکے باہمی تعلقات کے تین درجے قائم کئے جا سکتے ہیں اگرچہ ان کی نوعیت کی تمیز انکی ترتیب کے اندازے سے زیادہ آسان ہے۔ سب سے پہلے تو انکی کوشش یہ تھی کہ اہل مکہ کو کسی طرح رام کر کے اپنا ہم خیال بنالیں اور جب بہت سی تدبیریں ناکام رہیں تو وہ یہانتک بھی تیار ہو گئے کہ انکی دیویوں کی تھوڑی سی تعریف کر کے بت پرستی سے ایک قسم کا سمجھوتہ کرنا چاہا۔ جب یہ سمجھوتا قائم نہ رہ سکا تو انہوں نے فوراً بت پرستوں پر ایک شدید حملہ شروع کر دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور انکا خاندان دونوں جماعت سے نکالدئے گئے۔ اب کہ بندش ختم ہو گئی انہوں نے اہل مکہ کو انکی قساوت قلب کی بنا پر بالکل انکے حال پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کے وطن میں اب اسلام کی ترقی کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور خود انکی شخصیت بھی معرض خطر میں ہے علیحدگی کا یہ جذبہ اسوجہ سے اور سخت ہو گیا کہ اسی زمانے میں انکی وفادار بیوی خدیجہ کا انتقال ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد انکے بزرگ سرپرست اور حامی ابوطالب بھی چل بسے۔ چنانچہ انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ پاس کے شہر طائف میں چل کر ذرا قسمت آزمائی کریں اور یہ سوچکر تن تنہا چل کھڑے ہوئے وہاں پہنچکر انہوں نے بڑے بڑے لوگوں سے یہ دریافت کیا کہ کیا وہ انکے وہاں ٹھیرنے اور اپنے خیالات کی اشاعت کرنے کے موافق ہیں ان لوگوں نے صاف انکار کیا اور شہر کے بعض اوباش انکے پیچھے ہو لئے یہانتک کہ بہزار دشواری وہ شہر کے باہر آ کر دو شریف مکہ والوں کے انگور کے باغ میں پناہ گزیں ہوئے۔ شدید یاس اور ناامیدی کی

(××) کہ وہ عہد نامہ سب برباد ہو گیا، اس کے تمام حرف مٹ گئے صرف اللہ کا نام باقی ہے۔"

[1] یہ کس قدر حقیقت کے خلاف ہے! آپ نے کسی وقت ایسا نہ کیا، آپ کی وہی تعلیم تھی، پہلا دور جسمیں دیویوں کی تعریف آپنے کی محض افسانہ ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے اسی طرح تیسرا دور بھی محض افسانہ ہے، آپ نے کبھی انہیں ایسا نہیں چھوڑا کہ ایک قسم کی مصالحت ظاہر ہو۔ انکو اسی طرح سمجھاتے رہے جیسا کہ پہلے سمجھاتے تھے، ساتھ ہی ساتھ دیگر قبائل عرب کیطرف بھی توجہ کی۔

حالت میں انہوں نے پھر گھر کا راستہ لیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس وقت آپکی تسکین اس بات سے ہوئی کہ نخلہ کے مقدس کنج میں بیٹھکر جب وہ قرآن پڑھ رہے تھے تو کم از کم جنوں نے آکر اُسے سنا۔ ایسی حالت میں انکے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ مکہ سے نکل آنے کے بعد اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قطع کرکے دوسروں سے جا ملنے کا اعلان کر چکنے کے بعد وہ پھر وہاں کا قصد کر سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس وقت تک اس کی جرأت نہ کی جب تک کہ طویل گفت و شنید کے بعد ایک باعزت شہری مطعم بن عدی نے انہیں اپنی حمایت میں نہ لے لیا۔ باوجود ان سب واقعات کے، خدیجہ کی وفات کے دو ماہ بعد انہوں نے سودہ بنت زمعہ کے ساتھ جو ایک مہاجر حبشہ کی بیوہ تھیں عقد کرنیکا فیصلہ کر لیا۔

بہت تھوڑے سے عرصے کے بعد محض اتفاق سے محمدؐ کو وہ بات حاصل ہوگئی جو پیش بندی (یعنی سفر طائف) سے نہ ہو سکی تھی۔ اہل مکہ کو انکے حال پر چھوڑ دینے کے بعد محمدؐ نے ان عربوں سے ملنا اور انہیں تلقین کرنا شروع کیا جو مکہ۔ مجنہ۔ ذوالمجاز اور عکاظ میں حج یا دوسرے میلوں کی شرکت کے لئے آیا کرتے تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل (۲۰-۶۱۹ء) ایک دفعہ انکا گذر اہل مدینہ کی ایک ایسی جماعت پر ہوا جس نے خلاف معمول انکا مذاق بالکل نہ اڑایا بلکہ ان کی باتوں کے سمجھنے کی خواہش اور انکے خیالات کے قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس سے محمدؐ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہ لوگ اس قسم کے خیالات کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ انکا دن رات کا میل جول ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو ان کے ساتھ مدینہ اور قرب و جوار میں رہتے تھے اور کچھ ان تعلقات کی بنا پر جو ان کے اور نبطیوں یا شمال کے عیسائی عربوں کے درمیان پہلے سے تھے۔ حنیفیت ان لوگوں میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھی[۵۱] اور ساتھ ہی ساتھ ایک نئے مذہب کے ظاہر ہونیکی توقع بھی انکو تھی اور غالباً یہ خیال بھی تھا کہ اس کا بانی ایک عرب پیغمبر ہوگا۔ مدینہ محمد (صلعم) کے لئے مناسب جگہ تھی۔ محل تعجب ہے کہ یہ بات انہیں محض اتفاق سے

---

۵۱ اہل مدینہ میں حنیفیت کا زیادہ شائع ہونا محض قیاس ہے۔ جس طرح دو ایک حنیف مکہ میں کسی زمانہ میں تھے اسی طرح مدینہ میں کثرت اشاعت کا ثبوت کسی صحیح یا ضعیف تاریخی روایت میں نہیں ملتا۔

معلوم ہوئی[۵۱]۔ اب انہوں نے مدینہ والوں سے گہرے تعلقات پیدا کیے اور ان سے کہا کہ وہ اپنے شہر میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا وہاں انکے مقبول ہونے کا کوئی امکان ہے ان لوگوں نے اس کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ آئندہ سال آکر انہیں حالات سے آگاہ کرینگے۔

چنانچہ دوسرے سال ایام حج میں مدینہ کے بارہ آدمی محمد (صلعم) سے ملے اور انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ بجز خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کریں گے۔ دوسروں کے مال پر دست درازی نہ کریں گے زنا سے احتراز کرینگے۔ نوزائیدہ بچوں کو قتل نہ کریں گے۔ بدگوئی چھوڑ دینگے اور ایک معقول حد تک رسول خدا کے احکام کو مانیں گے۔ یہ عقبہ کی پہلی بیعت کہلاتی ہے۔ اب یہ بارہ آدمی مبلغین اسلام کی حیثیت سے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ انکو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ دوسرے سال نتائج تبلیغ سے رسول کو آگاہ کریں۔ مکہ کے مسلمانوں میں سے ایک شخص مصعب بن عمیران لوگوں کے ساتھ ہی یا شاید[۵۲] ان کے بعد اس لئے مدینہ بھیجے گئے کہ وہاں کے لوگوں کو قرآن پڑھنا سکھائیں اور اسلام کے عقائد و اعمال کی تعلیم دیں۔

اس نئی سرزمین میں اسلام بہت تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہ سمجھنا آسان ہے کہ کس طرح اس خوشی نے محمد (صلعم) کی روح کو بلند پروازی کی طاقت عطا کی۔ اس انتہائی مسرت سے جو انکی کیفیت تھی اس کا اندازہ اس سفر سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے رات میں یروشلم کا کیا تھا (سورۃ ۱۷-۱ و ۶-۲) اگر درحقیقت یہ واقعہ اسی زمانے کا ہے[۵۳]۔ یہ بھی کہا سکتا ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی بھی جو سورۃ نمبر ۳۰

---

[۵۱] قرآن مجید میں اسکا ذکر (۶، ۸۹) میں موجود ہے۔ یعنی اگر اہل مکہ اس پر یقین نہیں لاتے اور قبول نہیں کرتے تو ہم نے ایک دوسری جماعت انکے قائم مقام کر دی ہے جو اس پر ایمان لائے گی۔

[۵۲] حضرت مصعب ابن عمیران لوگوں کے ساتھ ہی بھیجے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو ابن ہشام مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۳۴

[۵۳] اس واقعہ کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے شعب ابی طالب کے زمانہ میں ہوا۔ بعض اس سے پہلے یا پیچھے بتاتے ہیں۔

میں موجود ہے گویا خود اپنی فتح کے یقین کا اظہار تھا اس لئے کہ اس زمانے میں وہ عیسائیوں کو اپنوں میں سمجھتے تھے لیکن یہ پیشین گوئی (جو قرآن میں واحد[1] پیشین گوئی ہے) معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے سے بہت پہلے کی ہو۔

ہجرت سے کچھ ہی پہلے حج کے موقع پر (مارچ ۶۲۲ء) مدینہ کے قافلے کے ساتھ ۷۳ مرد اور دو عورتیں ایسی تھیں جو اسلام لا چکی تھیں۔ قربانی کا دن گذار کر رات کے وقت بمقام عقبہ یہ سب لوگ محمد (صلعم) سے ملنے آئے۔ محمد (صلعم) کے ساتھ انکے چچا عباس بھی تھے جو ابوطالب کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے سردار تھے۔ یہ عقبہ کی دوسری بیعت کہلاتی ہے۔ اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ محمد (صلعم) مدینہ کو ہجرت کرینگے۔ ایک طرف عباس نے اپنے بھتیجے کو اپنی حمایت سے نکال کر مدینہ والوں کے سپرد کیا اور دوسری طرف اہل مدینہ نے یہ عہد کیا کہ اس سلسلہ میں جتنے فرائض ان پر عائد ہوں گے انکو کما حقہ ادا کریں گے۔ انہوں نے رسول کے سامنے یہ قسم کھائی کہ وہ ان کی اسی طرح حفاظت کرینگے جس طرح اپنی بیوی بچوں کی کرتے ہیں اور خود محمد (صلعم) نے یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ خود کو بہ تمام و کمال اہل مدینہ میں شمار کریں گے اور ان کی جماعت سے الگ نہ ہوں گے۔ روایت ہے کہ کہیں سے یک بیک شور کی آواز آئی اور یہ قابل ذکر مجلس برہم ہوگئی۔

اگرچہ یہ باتیں بہت چپکے چپکے کی گئی تھیں مگر پھر بھی اہل مکہ کو بہت جلد اس کی خبر لگ گئی۔ دوسرے

---

[1] قرآن کی دوسری پیشین گوئیاں مضمون نگار کو معلوم نہیں ہوئیں۔ اور صرف اسی کو واحد پیشین گوئی کہکر اپنی عدم معرفت کا اظہار کیا۔ (۱) ۵۴-۴۴ ۔ ۴۵ میں بدر کی ہزیمت کا ذکر ایسے وقت میں ہوا ہے جبکہ مسلمانوں کی حالت مکہ میں تشویشناک تھی۔

(۲) اسی طرح (۲۴-۵۵) میں خلافت ارض کا وعدہ بھی پیشین گوئی ہے جسکا ظہور بوجہ اتم ہوا۔

(۳) ہجرت کے بعد مکہ میں واپس آنا، اور وہاں آپ کا تسلط ہوجانا (۲۸-۸۵) الیضاً (۴۸-۲۷) اس قسم کی پیشین گوئیاں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔

روز صبح کو ان لوگوں نے ابن اُبَی سے جو مدینے کے قافلے کا کارواں سالار تھا دریافت کیا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی اور یہی واقعہ بھی تھا اس لئے کہ وہ ابھی تک اپنے آبائی دین پر تھا اور اسی وجہ سے اس کے مسلمان ہمراہیوں نے اس سے یہ راز نہیں کہا تھا اور خود اُسے بھی ان لوگوں کی رات کی غیر حاضری کا پتہ نہ چلا تھا۔ اہل مکہ کو صحیح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رات کو کیا ہوا تھا اور معلوم ہوا بھی تو اُس وقت جب مدینے والے جا چکے تھے۔ انہوں نے انکے پیچھے آدمی دوڑائے مگر کوئی فائدہ نہ نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے یہ کوشش کی کہ مکہ کے مسلمانوں کو ہجرت کرنے سے بالجبر باز رکھیں تھوڑے عرصہ کے وقفے کے بعد انہوں نے رسول کے پیروؤں کو از سر نو ایذا دینا شروع کیا۔ بعضوں کو ارتداد پر مجبور کیا[۵۱] اور اکثر کو قید میں ڈالدیا۔ لیکن ان تدابیر سے کام نہ چلا بلکہ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ دیر میں ہونیوالا تھا وہ بہت جلد سامنے آگیا۔ بیعت عقبہ کے چند روز بعد ہی محمد (صلعم) نے اپنے ساتھیوں کو ہجرت کرنے کا باقاعدہ حکم دیدیا۔ سلہ ہجری کے پہلے مہینے میں (اپریل ۶۲۲ء) ہجرت شروع ہوئی۔ دو ماہ کے عرصے میں تقریباً ۱۵۰ آدمی مدینہ پہنچ چکے تھے اور غلاموں کے علاوہ مکہ میں بہت کم مسلمان باقی رہے تھے[۵۲]

خود محمد (صلعم) ابو بکر اور علی کے ساتھ مکہ میں آخر تک رُکے رہے۔ انکے اس قیام کی وجہ اسی قدر لامعلوم[۵۳] ہے جسقدر اُنکے یک بیک ہجرت کر جانیکی۔ موخر الذکر کی وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ اہل

---

[۵۱] کسی تاریخ کی کتاب یا روایت سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کوئی شخص مرتد ہوا ہو، نہ معلوم مضمون نگار کو کس ذریعہ سے یہ علم حاصل ہوا۔ کسی ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا ہے کہ کچھ بحث کیجا سکے۔

[۵۲] ابن ہشام صفحہ ۳۱۵ و ۳۱۹ (و)

[۵۳] وجہ صاف ظاہر ہے۔ مدینہ میں آپ کی روانگی سے قبل جس انتظام کی ضرورت تھی اس کا مکمل ہونا۔ مکہ میں آپ کی اقامت کا ناممکن ہونا۔ غرض جس وقت کفار نے آپ کے قتل کا عزم مصمم کر لیا اور اس کے واسطے پوری تیاری کر چکے اسوقت آپکے واسطے بجز ہجرت کے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔

مکہ نے انکی جان لینے کی تدبیر سوچ لی تھی اس لئے وہ ابوبکر کو ساتھ لیکر چپکے سے مکہ سے روانہ ہوگئے
دو یا تین دن تک دونوں دوست جبل ثور کے ایک غار میں جو مکہ کے جنوب میں واقع ہے پوشیدہ
رہے تاکہ اگر کوئی تعاقب کیا گیا ہو تو وہ ختم ہوجائے (سورۃ ۹-۴۰) اب انہوں نے شمال کا راستہ
لیا اور ۱۲ ربیع الاول سلہ کو مدینہ پہنچ گئے۔ اس درمیان میں علی مکہ ہی میں تھے۔ وہاں انہوں
نے تین دن اور قیام کیا اس لئے کہ جیسا کہا جاتا ہے۔ ان تمام امانتوں کو جو رسول کے پاس تھیں
انکے مالکوں کے حوالہ کردیں۔ قریش نے انکو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ انکے راستے میں کوئی
رکاوٹ ڈالی یہانتک کہ آخرکار انہوں نے بھی مدینہ کی راہ لی۔

ہجرت مدینہ کے ساتھ رسول کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ کسی انسان کے حالات
میں شاذونادر ہی اتنا زبردست انقلاب ہوا ہوگا۔ اگر وہ مکہ ہی میں قیام کرتے تو زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے
تھے کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے جان دیدیں اور اس دین کو انکے جیتے جی کامیابی کا منہ دیکھنا شاید
ہی نصیب ہوسکتا۔ ہجرت نے یہ کردکھایا کہ وہ جو ایک نئے مذہب کے بانی تھے اس کی کامل فتح بھی
اپنی زندگی ہی میں دیکھ چکے اور انکے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام مدارج طے ہوگئے جو مسیحی دنیا میں عیسیٰ کے
زمانے سے لیکر قسطنطین کے عہد تک کہیں جاکر تمام کو پہنچ سکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عربی حکومت کے
قائم کرنے میں اسلام سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انکی کامیابی کی رفتار اس قدر
تیز تھی۔ لیکن یہ بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس سے مذہب کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اسلام بہت
جلد اپنی ابتدائی معنویت کھو بیٹھا اور یہاں آتے ہی علمی اور سیاسی مصالح کا کھوٹ اس میں مل گیا[1]۔ انتہی

---

[1] یہ نہایت غلط اور پامال خیال ہے جسے یورپین سیرت نویس گاتے جاتے ہیں، اسلام نے اپنی معنویت و روحانیت
کو اسی طرح مدینہ میں آخری وقت تک قائم رکھا، جس طرح مکہ میں تھی، البتہ اسلام نہ موسیٰ کے احکام کی طرح سخت سے
سخت پابندیاں مسلمانوں پر عائد کرتا ہے۔ نہ عیسیٰ کی طرح ایسی نرمی وسہولت کی تعلیم دیتا ہے جو کسی طرح ایک باعزت زندگی
گذارنے والی قوم کے لئے سزاوار نہیں ہے۔ اسلام نے ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر اس نقصان کی تلافی (××)

منزل مقصود تک پہنچ جانیکی وجہ سے اس میں ترقی کی صلاحیت ہمیشہ کے لئے ناپید ہوگئی۔ تمام اہم مسائل
کی تشکیل محمد (صلعم) کے ہاتھوں ہی ہو چکی تھی اور وہی صورت آجتک قائم ہے لیکن یہ بھی فراموش نہ کرنا
چاہئے کہ معنویت اور دولت روحانیت کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام[لے] عرب میں پیدا ہوا۔

(××) کردی جو پہلے مذاہب میں تھی۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو درویش و راہب محض نہیں بنایا۔ نہ جبر و
قہر کے حاکم اور سپاہی۔ بلکہ اس نے حکومت کے ساتھ فقر، سیاست کے ساتھ روحانیت کا ایسا اتصال
دکھایا جس کے سامنے دنیا کی نظر خیرہ ہوگئی اور جس کی نظیر کسی امت میں نہیں مل سکی۔
لہ اسلام نے تمام معاملات کی دو قسمیں کی ہیں، ایک محض دنیاوی، جس کے متعلق ہر قسم کے اختیارات ارباب
علم اہل حل و عقد کو حاصل ہیں، اور مصالح کی بنا پر ہر وقت انمیں رد و بدل کی گنجایش ہے۔ (مگر بدقسمتی سے
مسلمانوں نے ایسے امور میں بھی بیجا پابندیاں "فقہ" سے عائد کرلی ہیں۔) دوسرے وہ امور جو دینی یا روحانی
کہلاتے ہیں یہ توحید، معاد، اور عبادت کے خاص طریقے اور اسی ذیل میں معاملات دنیاوی کا ایک
حصہ جو روحانیت سے خاص قرب رکھتا ہے، جسکا اخلاق انسانی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ تمام امور بوجہ اتم اس
خوش اسلوبی سے طے فرما دئے ہیں کہ اگر انمیں غور و فکر کیا جائے تو احکام مشروعہ سے سر مو تجاوز کا کوئی
موقع نہیں مل سکتا۔
اسلام میں ترقی اور نمو کی وہ صلاحیت تھی (بشرطیکہ اُسپر عمل کیا جائے) جو قرن اول میں دیکھی گئی۔ اور جسکا
موافق و مخالف معترف ہے، یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے دنیا میں زیادہ انہماک کرکے اصول شرعیہ کو پس پشت
ڈالدیا، انکی روحانیت فنا ہوگئی، آپس کا اتحاد جاتا رہا اور اسکا جو لازمی نتیجہ تھا وہ ہو کر رہا۔ بایں ہمہ روحانیت
کا جہانتک تعلق ہے وہ اب بھی مسلمانوں میں یورپ سے زیادہ ہے۔
پس اسلام ہر قسم کی ترقی کے لئے ہر وقت قابل اور صالح ہے۔ عرب میں آنے سے اس میں کوئی خاص
کیفیت یا نقص نہیں پیدا ہوا۔ جو روحانی تعلیم عرب کے ایک بدو کی اصلاح و تہذیب کرتی ہے اور اسے
ابوبکر و عمر ابوایوب و ابوذر بناتی ہے وہی تعلیم نجاشی و قیصر کی ہدایت کرسکتی ہے، مگر قلب مضطرب (×)

شروع شروع میں محمد (صلعم) نے قبا میں جو شہر کے باہر ایک قصبہ تھا قیام کیا یہاں انکے بعض راسخ
ترین پیرو رہتے تھے اور انہوں نے ایک مسجد بھی بنا رکھی تھی۔ چند دن گذرنے کے بعد جب انہیں یہ یقینی طور
پر معلوم ہوگیا کہ انکا استقبال دل سے کیا جائیگا تو وہ شہر کے اندر داخل ہوئے۔ اسوقت اس شہر کا نام
یثرب تھا۔ ہر شخص انہیں اپنے یہاں ٹہرانے کا مشتاق تھا۔ اس خیال سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے
محمد (صلعم) نے فیصلہ اپنی اونٹنی (القصواء) پر چھوڑ دیا وہ بنو نجار کے محلہ میں ایک کھلی جگہ پر جاکر بیٹھ گئی
اسی جگہ کو انہوں نے اپنے مکان اور مسجد کے لئے منتخب کرلیا۔ سات ماہ تک انہوں نے ابو ایوب رض
کے مکان میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں مسجد بنکر تیار ہوگئی جو عبادتگاہ کا کام بھی دیتی تھی اور عام نشست گاہ
کا بھی۔ اسی سے ملحق رسول کا ذاتی مکان تھا جو انکی ازواج کے حجروں پر مشتمل تھا اور انہیں میں سے کسی
ایک میں وہ خود رہا کرتے تھے۔ اس وقت انکی ایک ہی بیوی تھیں یعنی سودہ جنکا ذکر پہلے ہوچکا ہے
لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد مزید براں انہوں نے کمسن عائشہ سے جو انکے دوست ابوبکر کی بیٹی تھیں
اور جنہوں نے بعد میں انکی طبیعت میں بہت رسوخ حاصل کیا عقد کرلیا۔ بعض سربرآوردہ مہاجرین
نے بھی آس پاس اپنے مکانات بنالئے لیکن اکثر لوگ اہل مدینہ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

مدینہ عربی سطح مرتفع کے مغربی کنارے پر وادی قناۃ میں واقع ہے۔ آتش فشانی مادہ سے
ترکیب یافتہ بنجر چٹانوں کے بیچ میں یہ ایک نخلستان ہے یہاں کے باشندوں کی روزی کا مدار کچھ تو کھجوروں
پر تھا اور کچھ ان کھیتوں اور باغات پر جو ان درختوں کے سایہ میں ہوا کرتے تھے۔ آبادی کا ایک حصہ
شہر میں رہتا تھا اور ایک حصہ مضافات اور آس پاس کے گاؤں میں۔ کسی زمانہ میں یہ نخلستان یہودیوں
کے قبضہ میں تھا۔ اسی طرح جس طرح اس سے شمال کے ایسے ہی نخلستان یعنی وادی القریٰ۔ خیبر۔ فدک

(x) عقل سلیم کی ضرورت ہے، جن کے قلوب زنگار ہوگئے ہوں، جنکی آنکھوں پر تعصب اور ہوا پرستی کے
پردے ہوں جن کے کان حق کے سننے سے بہرے ہوں وہ کسی طرح ایک نور واضح اور ہدایت ربانی سے مستفید
نہیں ہوسکتے۔

اور تیما۔ ابتک انکے پاس تھے۔ محمد (صلعم) کے زمانے سے چند صدی پہلے یمنی عرب بنو قیلہ یہاں آکر آباد ہوگئے تھے اور انہوں نے یہودیوں کو قریب قریب یہاں سے نکالدیا تھا۔ بہت سے یہودی اب بھی یہاں رہتے تھے کچھ تو عربی قبائل میں پھیلے ہوئے تھے اور انکی حمایت میں تھے اور کچھ آزاد گروہوں میں رہتے تھے مثلاً قینقاع۔ نضیر اور قریظہ۔ انکی خوش قسمتی سے عرب آپس میں متفق نہ تھے۔[1] بنو قیلہ کی دو شاخیں تھیں اوس اور خزرج جو ہمیشہ برسرپیکار رہتی تھیں، باہمی دشمنی اور منافرت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اگر اتفاق سے قبیلہ اوس کا کوئی فرد خزرج کے محلہ میں چلا جاتا تو اس کی جان و مال کی خیر نہ تھی اسی طرح اگر خزرج میں سے کوئی آدمی اوس کے محلہ میں آجاتا تو اسکا بھی یہی حشر ہوتا۔ محمد (صلعم) کے آنے سے کچھ عرصہ قبل مدینہ میں ایک بہت بڑی جنگ ہوئی تھی جسکا نام جنگ بعاث ہے۔ اس میں قبیلہ اوس نے اپنے یہودی حلیفوں کی مدد سے خزرج کو سخت ہزیمت دی اور انکا زور بالکل توڑ دیا۔ خزرج تعداد میں زیادہ تھے، اقتدار میں بھی بڑھے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سردار ابن اُبی کو مدینہ کا بادشاہ بنانے کے لئے بالکل تیار ہی بیٹھے تھے۔ جنگ بعاث سے جماعتوں کا توازن۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نزاع۔ بدستور قائم رہا اور اس سے ایک تیسرے شخص نے فائدہ اٹھایا جو اس مناسب وقت پر آن پہنچا اور جس نے ان کمزور اور قریب الاختتام خانہ جنگیوں کو موقوف کرکے امن قائم کردیا۔

اس وقت کے حالات غیر معمولی طور پر اس کے لئے موزوں تھے کہ اس مذہبی اثر کو جو محمد (صلعم) اپنے ساتھ لائے تھے ایک سیاسی رنگ دیدیں اور انہیں بانی مذہب سے بانی سلطنت بنادیں۔ عربوں میں ابتک یہ دستور تھا کہ ایسے تمام جھگڑے اور اہم قضیئے جو معمولی طریقوں سے نہ سلجھ سکتے ہوں اُن کا انہوں

---

[1] عرب جس زمانہ میں آئے تھے (غالباً اسلام کے دو تین صدی پیشتر) متفق تھے، اور آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا، اسی زمانہ میں یہود پر غلبہ پایا، انہیں شہر سے الگ کردیا، اور آہستہ آہستہ اپنا تسلط قائم کیا، مگر اسلام سے کچھ قبل (غالباً چالیس برس) آپس میں ناچاقی ہوگئی جس کی بنا محض ایک آدمی کا قتل تھا جس میں دونوں فریق عرصہ تک لڑتے رہے۔

کے سامنے جو تیجانوں میں رہتے تھے آسمانی فیصلے کے لئے پیش کئے جاتے تھے۔ محمد (صلعم) کو جو دینی اعتبار حاصل تھا اسکا براہ راست یہ اثر پڑا کہ اکثر اوقات مختلف مسائل انکے سامنے مشورے اور فیصلے کے لئے پیش کئے جانے لگے۔ مدینہ میں جھگڑے اور پیچیدگیاں بہت تھیں اور ایک ایسی با اقتدار شخصیت کی اشد ضرورت تھی جو دونوں فریق پر برابر اثر ڈال سکے۔ محمد (صلعم) نے اس ضرورت کو ایسے انداز سے پورا کیا جو عربوں کو بہت پسند آیا۔ انکا اقتدار طاقت پر مبنی نہ تھا بلکہ اسکا انحصار خداوندی فیصلے کے برضا و رغبت ماننے پر تھا اور اس میں کسی کے لئے کوئی شرم کی بات نہ تھی۔ اصولاً تو یہ اُسی قسم کا قانونی اور اجتماعی اقتدار تھا جو قدیم کاہنوں کو حاصل تھا لیکن عملاً اس کا زور بہت زیادہ تھا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ حالات بہت زیادہ مناسب تھے بلکہ سب سے زیادہ اہم سبب خود محمد (صلعم) کی شخصیت تھی۔ تاریخ کو سمجھنا اس وقت تک بالکل ناممکن ہے جب تک ہم اس عظیم الشان روحانی اثر کا صحیح اندازہ نہ کرلیں جو محمد (صلعم) کو عربوں پر حاصل تھا۔ خود کو خدا کا پیغمبر کہنا اور اپنے کلام کو خدا کا کلام بتانا اس شخص کے لئے مطلق مفید نہیں ہو سکتا جس پر لوگوں کو اعتماد نہ ہو اور وہ اعتماد جو محمد (صلعم) کو حاصل تھا کسی زمانے میں اور کسی مدت کے لئے بھی نہ ایک مفتری کو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ایک فریب خوردہ شخص کو۔ اسکے علاوہ انکی وہ عظمت بھی جو نبی ہونیکی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں تھی بالکل کام نہ دیتی اگر انکے فیصلے غلط اور عقل سے بیگانہ ہوتے بخلاف اسکے انکے فیصلے حق اور عقل سلیم کے مطابق ہوتے تھے وہ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور گتھیاں سلجھا سکتے تھے انہیں صرف جوش ہی جوش نہ تھا بلکہ قوت عمل بھی پوری طرح موجود تھی۔

تھوڑے ہی دن کے بعد وہ اُس چیز کا جو ابتدا میں انہیں بطور اختیاری ہدیے کے پیش کی گئی تھی حق کی حیثیت سے مطالبہ کرنے لگے۔ سنہ ہجری کے ابتدائی سالوں میں مدینہ کے لئے جو نظام مرتب کیا گیا تھا اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:۔ "ہر وہ جھگڑا جو تم لوگوں میں پیدا ہو خدا اور رسول کے سامنے پیش کیا جائے گا[۵۷]"۔ اور قرآن میں بھی ان لوگوں کو زجر و توبیخ کی گئی ہے جو ابتک جھوٹے معبودوں

---

[۵۷] ابن ہشام ۳۴۲ و ۱۷ (د)

یعنی کاہنوں اور راہبوں کو حکم بناتے ہیں۔ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ رسول "حاکم بامر اللہ" کی حیثیت سے سارے مدینہ میں سب سے زیادہ با اثر آدمی ہو گئے۔

یوں محمد (صلعم) نے اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط کیں بالکل اسی طرح جس طرح کہا جاتا ہے کہ موسٰے نے کیا تھا۔ (Exod. XVIII) جیسے موسٰے کے فیصلوں سے توراۃ تیار ہوئی اسی طرح انکے فیصلوں سے "سنت"، انکا اصلی کام غالباً یہی تشریعی اور تنظیمی کوششیں تھیں جن کو آخری دم تک نہایت خاموشی کے ساتھ انہوں نے جاری رکھا۔ بہر کیف اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ کام کیا وہ نہایت درجہ مفید تھا۔ اگر انکی وجہ سے اتنا ہی ہوتا کہ ایسے ملک میں جہاں اس سے قبل خونریزی، خود غرضی یا بیش از بیش ہنگامی اور خود اختیاری معاہدات کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، قانون اور انصاف کی حکومت ہو جاتی تو بھی بہت تھا۔ مگر صرف یہی نہیں ہوا بلکہ انکی قانون سازی بھی (اگر ہم واقعی اسے یہ نام دے سکیں) قدیم عربی رسم و رواج سے بدرجہا بہتر اور بلند تھی۔ خصوصیت کے ساتھ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اس امر کی طرف منعطف کی کہ حق ملکیت کی حفاظت کے لئے ایک آہنی دیوار کھڑی کردیں اور صنف نازک کا رتبہ ازدواجی معاملات میں بلند تر کردیں۔ قصاص کو انہوں نے قائم رکھا مگر اس کی نوعیت بالکل بدل دی، اس طرح کہ اس کی اجازت یا یوں کہنا چاہئے کہ سزائے موت کا حق کسی دوسرے کو نہ تھا اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہر کہ جو کچھ موجود تھا اس سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا خواہ وہ عربی رسم و رواج کی صورت میں رہا ہو یا یہودی قانون کی۔ موخر الذکر کی پیروی انہوں نے بالخصوص اپنے ان قوانین میں کی ہے جو ازدواج سے متعلق ہیں۔

نئی صورت حالات کا قطعی طور پر یہ اثر ہوا کہ سلطنت کی عمارت بنانے میں مذہب کا مرتبہ ایک معمولی خادم سے زیادہ نہیں رہا، لیکن شاید ہی کہیں یہ خدمت اس خوبی سے انجام دی گئی ہو یا منزل مقصود تک پہونچنے میں اس خدمت سے یہاں سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا ہو[1] مکہ میں اسلام اپنی بالکل

---

[1] اس قسم کے خیالات کے اظہار کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپ والوں کے دماغ میں مذہب کا صرف (م)

ابتدائی حالت میں محمدؐ کے ذاتی یقین سے زیادہ اور کچھ نہ تھا اور ہزاروں پس و پیش کے بعد وہ اس کی تبلیغ واشاعت پر تیار ہوئے تھے[1]۔ پھر بھی اس تبلیغ سے انکا مقصد صرف یہی تھا کہ لوگوں کے دلوں میں انفرادی حیثیت سے ایمان جاگزیں ہو جائے۔ اس زمانے میں جو باتیں وہ بتایا کرتے تھے وہ بہت سادہ اور عام فہم ہوتی تھیں مثلاً یہ کہ انسانوں کو خدا پر ایمان اور یوم الحساب پر یقین رکھنا چاہئے۔ زندگی کو نیکی اور تقوے کے ساتھ گذارنا چاہئے بہل اور بیکار مشاغل میں صرف نہ کرنا چاہئے۔ خود پسندی اور حرص سے احتراز واجب ہے وغیرہ وغیرہ اس میں شک نہیں کہ وہیں ایک جمعیت قائم ہو چکی تھی اور دشمنوں کے مظالم سے اسے ایک طرح استحکام بھی نصیب ہو چکا تھا اور مذہبی اجتماع بھی ہوتے تھے اور نماز بھی باجماعت ادا کیجاتی تھی لیکن با اینہمہ ہر چیز تغیر پذیر اور بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور مذہب کی داخلیت ابھی فنا نہیں ہوئی تھی۔ ہجرت کے دو سال بعد آہستہ آہستہ یہ کیفیت بدل گئی اور مذہب۔ اگر بالکل نہیں تو کم از کم بہت بڑی حد تک۔ ملت کے لئے محض ایک فوجی نظام رہگیا۔ لا الہ الا اللہ انکے معتقدات کا لب لباب تھا لیکن تصدیق بالقلب پر اتنا زور نہیں

(×) وہی تخیل جاگزیں ہے جس کی تبلیغ حضرت عیسیٰ نے کی یعنی سراسر ترک دنیا اور اعمال دنیا سے لاپروائی حالانکہ انکے سامنے یہودیوں کا مذہب بھی موجود ہے جس میں غالب حصہ احکام وغیرہ اور سلطنت کے قیام سے متعلق ہے اپنے اپنے زمانے میں یہ دونوں مذاہب ضروری تھے اور اسی قسم کے احکام کی ضرورت تھی۔ اس کا صحیح اندازہ ان عہدوں کے حالات کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ اسلام کا مقصد ان دونوں میں امتزاج پیدا کرنا ہے۔ اس میں دین و دنیا دونوں کے متعلق ضروری تعلیم موجود ہے اور یہی فطرت انسانی کے مطابق بھی ہے۔ انسان نہ محض دین کا ہو سکتا ہے اور نہ محض دنیا کا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ

[1] اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ مکہ میں اسلام ذاتی یقین اور اُس کی تبلیغ سے زیادہ نہ تھا۔ مگر ایک تو آپ کا ہزاروں پس و پیش کے بعد اسکی تبلیغ کیلئے تیار ہونا جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے غلط اور بے اصل ہے۔ دوسرے آپکو یقین تھا کہ اسلام اپنا حق (غلبہ) حاصل کر کے رہیگا۔ چنانچہ انبیاء سابقین کے قصص اور آیات "العاقبۃ للمتقین"، "سیھزم الجمع ویولون الدبر"، وغیرہ سے اسکی پیشین گوئی گیگئی۔

دیا جاتا تھا جتنا اقرار باللسان[1] پر۔ یہی قومی شعار تھا، اور یہی نعرۂ جنگ، عبادت نے فوجی ورزشوں کی شکل
اختیار کرلی تھی اور تمام مقتدی امام کے حرکات وسکنات کی حرف بہ حرف نقل کرتے تھے۔ مسجد دراصل اسلام
کی بہت بڑی ورزش گاہ تھی اور یہیں مسلمانوں کو جماعتی عصبیت، اخوت اور اطاعت احکام کا جو انکی
فوجوں کا طرۂ امتیاز تھا سبق دیا جاتا تھا۔

اقرار توحید اور نماز کے بعد زکوٰۃ اور صدقات کا درجہ تھا اور یہ تیسرا اہم ذریعہ تھا جسے محمد (صلعم) نے اپنے
ساتھیوں میں جذبہ یگانگت کو ابھارنے اور اُسے بروئے کار لانے کے لئے اختیار کیا تھا۔ زکوٰۃ رفتہ رفتہ
ایک طرح کا محصول بن گئی اور آگے چلکر اسی پر مسلمانوں کے مالی نظام کی بنیاد رکھی گئی اور ساتھ ہی ساتھ

---

[1] یہ صریحاً اول تمام قرآنی آیات واحادیث کے خلاف ہے جن میں صرف اخلاص اور قلب سے قبول کرنا یا نہ کرنا باعث نجات
وعذاب بتایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک جماعت ایسی بھی تھی جو برائے نام مسلمان تھے اور دل سے
اُنکا تعلق کفر وشرک سے تھا۔ یہ منافقین کی جماعت تھی، مگر اسلام انسانی طاقت سے باہر حدود میں اپنی مداخلت
نہیں کرسکتا، یعنی اسلام کا حکم محض ظاہری اعمال پر محدود ہے، اگرچہ وہ درحقیقت بالاصالۃ اور اولاً قلب سے
متعلق ہے، پس جو شخص کہ قلب سلیم سے توحید، رسالت، معاد اور اسلامی عبادات کا معتقد وعامل نہیں
وہ ہرگز سچا مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ظاہری اعمال قلبی کیفیت کے مظاہر اور اس کے ممد ومعین ہیں، اس کی
تفصیل مکی اور مدنی سورتوں میں بہ کثرت موجود ہے۔ البتہ ایسا شخص ظاہراً مسلمانوں کی جماعت میں شمار
کیا جائے گا جو بظاہر اسلامی احکام کا متبع ہے۔ اس سے ہرگز یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام محض ظاہری
اعمال پر منحصر ہوگیا، نہ یہ کہ ظاہری ورزشیں اُس کی اصل الاصول ہیں صرف آیہ (۱۷۷، اور ۱۸۹ سورہ ۲)
کا حوالہ اس کے واسطے کافی ہے۔ ورنہ کوئی سورۃ اس مضمون سے خالی نہیں کہ صرف ظاہری اعمال
کوئی حقیقت نہیں رکھتے جب تک کہ باطن درست نہ ہو، البتہ محض باطن پر بھی اعتماد نہیں کیا گیا، بلکہ ہر دو
کو لازم وملزوم بتایا گیا۔

اسلامی سلطنت کی دیوار بھی گویا اسی پر قائم ہوئی۔ مذہب نے ایسی عملی نشوونما پائی کہ زکوۃ کا صرف
نام ہی نام باقی رہ گیا اور یہ مفید وہم کہ ہر قسم کا محصول خدا کو ادا کیا جاتا ہے[51]۔

جیسے جیسے اسلام کے نام لیوا باہمی اتحاد کی رسی کو مضبوط پکڑتے گئے اسی رفتار سے غیروں
سے انکی بیگانگی بڑھتی گئی۔ اگر مکہ میں محمد (صلعم) کا برتاؤ دوسرے موحدین کے ساتھ اس اصول
کے ماتحت تھا کہ "جو ہمارا مخالف نہیں وہ ہم میں سے ہے" تو مدینہ میں آکر انکا اصول یہ ہوگیا کہ
"جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے[52]"، حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ انہیں بالخصوص
یہودیوں کے ساتھ معاملہ کرنا تھا۔ ان لوگوں نے غیر ارادی طور پر محمد (صلعم) کے لئے مدینہ میں زمین
تیار کردی تھی اور محمد (صلعم) بھی ان سے بہت سی امیدیں رکھتے تھے چنانچہ شروع شروع میں ان

---

[51] کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے مضمون نگار کا کیا مطلب ہے۔ ابتک تمام مسلمان زکوۃ کو ارکان اسلام میں سے
ایک سمجھتے ہیں اور جبتک مسلمانوں کی حکومت تھی یا مرکزی نظام قائم تھا اُس وقت تک برابر زکوۃ ایک جگہ
جمع ہوتی تھی اور اسکا مصرف بھی صحیح تھا۔ اسلام میں زکوۃ کے متعلق جو احکام ہیں اس کی مثال تو کوئی
دوسرا مذہب پیش ہی نہیں کرسکتا۔ انفرادی خیرات اور سخاوت کے احکام کے علاوہ سالانہ آمدنی پر ایک ایسا
محصول عائد کردیا جس سے غربا کی پرورش اور ملک کا انتظام ہوسکے۔ اسلام کے بہترین مذہب ہونے کی بہت
بڑی دلیل ہے۔ اگر دنیا زکوۃ کے اسلامی نظام کو تسلیم کرلے اور اُسے اُسی طرح صرف بھی کرے جس طرح اسلام
نے بتایا ہے تو ہرگز اُسے اجتماعیت یا اشتراکیت کے خطرناک طریقے کو اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے
جس میں فائدہ کم اور نقصانات کا امکان زیادہ ہے۔

[52] یہ سراسر بہتان ہے۔ قرآن کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو (سورۃ ٦٠-٨) لاینہاکم اللہ
عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروہم وتقسطوا الیہم ان اللہ یحب
المقسطین ٥

لوگوں سے بھی اُنہوں نے وہی برتاؤ برتا جو ان عربی قبائل سے برتتے تھے جنہوں نے انہیں امان لیا تھا۔ لیکن جب اوس اور خزرج سے ان کے تعلقات مضبوط ہو گئے تو ان تعلقات میں جو یہود سے تھے کمزوری آتی گئی۔ مذہبی اور سیاسی اثر کا امتزاج، مذہب سے ایک طرح کے نظام حکومت کی تخریج اور رسالت سے بادشاہت کیطرف عدول۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن سے یہود کو کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا[۱]۔ اس کے علاوہ جہاں مدینہ کے قدیم نظام میں جو فرسودہ، غیر مرتب اور از کار رفتہ ہو چکا تھا۔ خارجی عناصر کے داخل ہو جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی وہاں اسلام کے جدید آئین سیاست نے صورت حالات بالکل بدل دی اور یہ ضروری ہو گیا کہ یہ عناصر یا تو اُس میں جذب ہو جائیں یا خارج کر دئے جائیں۔

محمد (صلعم) کو یہود سے جو مخالفت پیدا ہو گئی تھی وہ شروع شروع میں تو عملی نہیں بلکہ زیادہ تر نظری شکل میں رونما ہوئی اور بالخصوص اس طرح کہ وہ بعض اُن اہم اعمال میں جو انہوں نے یہودیت

---

[۱] کس لئے؟ کیا یہ کوئی ایسی نئی بات تھی جو یہود نے موسیٰ اور داؤد، سلیمان وغیرہ میں نہیں دیکھی تھی؟ یا محض حسد و بغض کی وجہ سے۔ بادشاہت کی طرف عدول کرنے سے مقصد اگر زندگی کو تکلف و تعیش میں گذارنا اپنی ذاتی اغراض کو دخل دینا، اپنی آل و اولاد کو منصب حکومت پر فائز کرنا ہوتا تو البتہ اعتراض ہو سکتا تھا لیکن یہ باتیں آپ میں نہ تھیں نہ اس سے آپ کا کسی قسم کا تعلق تھا، ہاں قانون کو جاری کرنا اس میں امیر و غریب شریف و وضیع کو یکساں قرار دینا، غربت و فقر کی زندگی گذارنا، سادگی اور تنگی سے آخری وقت تک رہنا، یہ آپ کی ممتاز صفت ہے جو ابتدا سے تھی اور آخر تک رہی۔ یہود نے حسد اور بغض، خباثت نفس اور غدر سے مدینہ کے امن و امان میں خلل ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آپ اور آپ کی جماعت کی ہر ایک صورت سے بیخکنی کی ہر وقت تدبیر سوچتے رہے، اور عمل کے وقت اُس میں دریغ نہیں کیا۔ اس لئے اس کا بدلہ جو ایک منصف مدبر عادل سے اُنہیں مل سکتا تھا، ملا۔

سے اخذ کئے تھے ایک امتیازی شان پیدا کرنیکی نہایت احتیاط سے کوشش کرنے لگے تھے یہاں تک
کہ یہی چیزیں اسلام اور یہودیت کے درمیان خصائص تمیزی کا کام دینے لگیں۔ مثال کے طور پر
قبلہ ہی کو لے لیجئے کہ پہلے یروشلم تھا اور اب مکہ ہو گیا یا صوم عاشورہ کو جس کی جگہ ابماہ رمضان نے
لی۔ یوم جمعہ کو نماز با جماعت کے لئے مخصوص کر دینے میں بھی ممکن ہے کہ یہودی یوم السبت سے
اختلاف مد نظر رہا ہو۔ ان تبدیلیوں میں سب سے زیادہ اہمیت "تحویل قبلہ" کو حاصل ہے اس لئے
کہ اسلام کو انفرادی دین سے سیاسی دین بنانے کی تدریجی کوشش کے ساتھ ساتھ اسے خالص عربی
دین بنا دینے کا جو عمل جاری تھا اس کی تکمیل اسی پر ہوتی ہے۔ یروشلم کی جگہ مکہ کو قبلہ بنا کر محمدؐ نے
صرف یہی نہیں کیا کہ یہودیت سے تمام تعلقات منقطع کر لئے اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا بلکہ سب سے
بڑی بات یہ کی کہ بت پرستی کے ساتھ ایک طرح کی رعایت کر کے اسلام کو قومی مذہب بنا دیا[1] اور مقصد اس
سے یہ تھا کہ بکھرے ہوئے قبائل کو ایک شیرازہ میں منسلک کر دیں اور اس طرح ایک ملت کی بنیاد رکھ دیں
مکی تیوہار کو مسلمانوں کی عید (عید الضحیٰ) بنا دینے کے بھی یہی معنی ہیں چنانچہ مسلمانوں پر یہ فرض کر دیا گیا

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیام مکہ اور ہجرت کے بعد کسی وقت خانہ کعبہ کو بتخانہ نہیں بتایا، نہ اس کی کوئی مخالفت
کی، بلکہ اس میں یا اس کے ارد گرد جو بت تھے اس کی مخالفت کی۔ قرآن مجید سورہ ابراہیم اور دیگر سورتوں میں بنا،
ابراہیم اور فضیلت کعبہ مذکور ہے، جو ایسے وقت میں تھی کہ مسلمان ہر قسم کی مصیبت میں مبتلا تھے، پس یہ کہنا کہ مکہ
میں خانہ کعبہ کو بتخانہ کہا جاتا تھا، اور مدینہ میں اسے قبلہ بنایا گیا۔ بالکل خلاف واقعہ اور بہتان ہے، نیز اسلامی حج
کا مرکز بجائے خانہ کعبہ کے عرفات کا میدان ہے، جہاں نہ کسی پتھر کی عظمت کیجاتی ہے، نہ کسی عمارت کی، نہ کوئی عمارت
ہے۔ بلکہ جاہلیت سے ابتک وہاں کوئی ایسا نشان نہیں پایا جاتا، بجز اس کے کہ سب لوگ عام میدان میں کھڑے
ہو کر اپنے گناہوں کو یاد کریں، اور اس عالم ثانی (آخرت) کا منظر پیش نظر کریں۔ خود خانہ کعبہ کی عزت و عظمت،
بحیثیت ایک بت خانہ کے کسی زمانہ میں نہیں تھی نہ رہی، بلکہ بحیثیت ایک خدا کے معبد ہونے کے جسے ابراہیم
علیہ السلام نے بنایا، اور جہاں سے صرف توحید کی ندا، دی۔

(باقی نوٹ کیلئے دیکھو صفحہ ۵۱)

ہے کہ اگر وہ اس مقام پر موجود نہ ہوں جب بھی جہاں تک ممکن ہو اس عید کو منائیں۔

اس طرح گویا اسلام کے یہ پانچ ارکان قائم ہوئے:۔ توحید۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ اور حج۔ اسمیں شک نہیں کہ ان ارکان میں گہری معنویت کے قبول کرنیکی صلاحیت موجود ہے لیکن ان میں بڑی خوبی یہ ہو کہ اگر ان کی ظاہری پابندی پر بھی اکتفا کیجائے تب بھی یہ بہترین ذریعہ ہیں اُس جماعتی عصبیت اور اخوت اس اطاعتِ خدا ورسول کے پیدا کرنے کا جن پر اسلامی نظام کے استحکام کا دار و مدار ہے اُس زمانے تک عرب میں تمام سیاسی اور سماجی تعلقات کی بنا، آبائی رشتوں پر تھی۔ ایسی بنیاد پر ایک باقی رہنے والی عمارت کا قیام کسی طرح ممکن نہ تھا اس لئے کہ خون جتنا لوگوں کو ملاتا ہے اتنا ہی جدا بھی کرتا ہی۔ لیکن اب مذہب میدان میں آیا اور جماعتی نظام کی تعمیر میں اسکی کارفرمائی نہایت مستعدی کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس نے پرانی دیواروں کو بے رحمی سے مسمار کر دیا تاکہ ان ٹوٹے ہوئے اجزا کو از سر نو جوڑ کر ایک پائندہ تر عمارت کھڑی کر دے۔ لوگوں کے دل بالکل بدل گئے اور قدیم تعلقات کا تقدس خدا کے سامنے بالکل محو ہو گیا۔ اگر محمد (صلعم) چاہتے تو ایک بھائی دوسرے بھائی کی گردن مارنے کو تیار ہو جاتا۔ بہترین مسلمان وہ سمجھا جاتا تھا جو قدیم سے بے تعلقی اور جدید سے تعلق پیدا کرنے میں سب سے کم پس و پیش کرے۔ محمد (صلعم) ان طبیعتوں کو ترجیح دیتے تھے جو ہمیشہ مصروفِ عمل رہتی ہیں خواہ وہ کبھی کبھی راہ سے بھٹک ہی کیوں نہ جاتی ہوں۔ استغراقی زہد اور تعبد کی وہ صرف زبان سے تعریف کر دیا کرتے تھے[۵۱]۔ ہزاروں خاندانوں کی غیر منظم حکومت پر خدائے واحد کی مطلق حاکمیت نے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۰) عاشورے کے روزے کی بابت اتنی فضیلت ثابت ہی۔ البتہ فرض ہونا خود محلِ بحث ہی یعنی کیا وہ کسی زمانہ میں فرض تھا؟ اور پھر منسوخ ہوا۔

[۵۱] یہ بیان خلاف واقعہ ہی، آپنے صرف استغراقی زہد و تعبد کی کبھی تعریف فرمائی نہ محض ظاہری عمل کرنے والوں کو اگرچہ وہ راہ سے بھٹک جائیں پسند فرمایا۔ آپ کی تعریف ایسے زہد و تعبد کے لئے ضرور واقع ہوئی جو عمل سے وابستہ ہو جس میں ایک زاہد و عابد حاکم و عامل ہو، جو دین کے ساتھ دنیا کو ملائے۔ محض زہد و استغراق (x)

فتح پائی اور اس کی رعایا مضبوط ترین رشتے میں منسلک ہوئی۔ ہر مسلم دوسرے مسلم کا بھائی تھا اور غیر مسلم کے مقابلے میں قدرتی طور پر اسکا ساتھ دیتا تھا۔ اسلام کے دائرے سے باہر نہ کوئی قانون تھا اور نہ امن[۱]۔ اللہ ہی قادر مطلق ہے اور وہ صرف ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی کامل اطاعت کرتے ہیں۔

مہاجرین یعنی وہ لوگ جو مکہ سے رسول کے ساتھ آئے تھے گویا ملت کی جان تھے۔ ان کے لئے اس اصل اصول کو۔ کہ مدینہ میں عزت کا مدار خاندان نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ کامیاب بنانا اس وجہ سے اور زیادہ آسان ہو گیا کہ وہاں کے اصلی باشندے (انصار) اوس اور خزرج باہمی منافرت کی وجہ سے ایک دوسرے کا زور توڑ چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں محمد (صلعم) کے دل میں نہ صرف یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ غیر مسلموں سے تمام رشتے منقطع کرلیں بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خود مسلمانوں میں حتی المقدور نسل کے تمام امتیازات کو ایک مشترک مذہب کے ذریعے سے فنا کردیں لیکن انہوں

(×) کو رہبانیۃ فرماکر اسلام کے مقصد کے مخالف بتایا، سورہ ۲۳، آیہ ۱۲ اور ۲۴۔ ۲۷، ۳۸ میں مسلمانوں کے حقیقی اوصاف مذکور ہیں، اسی طرح ۳۔۱۹، ۲۰۰، ۔ اور ۲۵۔ ۶۳، ۷۶ تک ان روحانی اوصاف کو جن کے ساتھ دنیاوی خصائل بھی جمع ہوں مفصل بیان فرمایا ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد کوئی ذی فہم یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام نے محض زہد و تعبد کی تعریف کرکے عمل کا کوئی درجہ نہیں رکھا، یا محض عمل کو پسند کرکے زہد و تعبد کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی۔

[۱] اگر دنیا کی عام حالت کے اعتبار سے اسے سمجھا جائے تو واقعہ یہی تھا کہ نہ کوئی قانون تھا نہ امن۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے اور غالباً مضمون نگار کا یہی مقصود معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے فرقوں کے لئے مسلمانوں کے پاس کوئی قانون یا امن کا سلسلہ نہ تھا تو یہ واقعہ کے خلاف ہے، اسلام نے خود ایسے فرقوں کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے اور ان کے جان و مال اسی طرح محفوظ کئے جس طرح ایک مسلمان کے۔

نے جلد اس خیال کو چھوڑ دیا اور نہایت تصریح کے ساتھ قدیم خاندانی حقوق اور حق وراثت کو اسلام
میں جائز بلکہ مقدس ٹھہرایا (سورۃ ۸-۷۶)[۵۲] اس طرح انہوں نے مساوات کے کلیہ پر اس حد تک
عمل نہیں کیا قیاس جسکا مقتضی تھا بلکہ عملی مشکلات کی وجہ سے جماعتی نظام کو پرانے ڈھنگ پر چلنے دیا۔
آخر میں تو انہوں نے رشتہ داری اور خون کے تعلقات کو اتنے حقوق دیدئے جو ایک طرح اسلام کے
منافی تھے اور اس طرح گویا خود ہی ان جھگڑوں اور فسادوں کی نبیاد رکھی جنہوں نے عہد اموی میں خاص طور
پر ملت کے شیرازے کو بالکل بکھیر دیا[۵۳]۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابتداءً اسلامی اصول میں اشتراکیت

---

۵۲ اوائل ہجرت میں مواخاۃ کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا تھا، جس میں ایک مہاجر ایک انصاری عوناً لیا گیا تھا،
اور ان دونوں کا بھائی چارہ اس صورت سے کیا گیا تھا کہ مسافر مہاجر کو پردیس میں یک گونہ مدد ملے اور
اس کے واسطے مستقر و جائے اقامت مہیا ہو، اسی کے ساتھ انصار نے فراخدلی بلند ہمتی و عالی حوصلگی سے
مہاجرین کو اپنے مال و اسباب و جائداد کا حصہ دار بنا دیا حتیٰ کہ میراث میں بھی انکا حق رکھا، کیونکہ پہلے عرب میں
ایک دستور تھا کہ حلیف کا نسب اس قوم میں شامل ہو جاتا تھا جس سے وہ عہد کرے اور میراث سے بھی اُسے
کچھ حق ملتا تھا سورہ ۴-۲۳ میں اسکا ذکر ہے، عرصہ کے بعد جب مہاجرین بھی مالدار ہو گئے، انصار سے
کہا گیا تم اگر چاہو تو اس میں حصہ لو، یا مہاجرین کو جو حصہ اپنی جائداد کا دے چکے ہو واپس لیلو۔ وہ دوسری
صورت پر راضی ہو گئے اور ضرورت رفع ہو جانے کی وجہ سے آیہ ۷۵ (نہ ۷۶) سورہ ۸ نازل ہوئی جس
نے پہلے حکم کی تنسیخ کر دی۔

۵۳ اسلام نے رشتہ اور قرابت کو کوئی ایسے حقوق نہیں دئے جو عام اسلامی مساوات سے ٹکرائیں۔ نہ آپ نے
اپنے خاندان کو کوئی ایسا حق دیا، نہ دوسرے کسی خاندان کو، بلکہ بعض ایسے حقوق سے جن میں شبہ کی گنجائش
ہے اپنے خاندان کو روک دیا مثلاً صدقات انپر حرام کر دئے۔ قرآن کا آخری اور حتمی فیصلہ یہی جس میں کوئی
تغیر نہیں ہو سکتا۔ یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا،
ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، ان اللہ علیم خبیر ۵ (۴۹-۱۳) (××)

کا عنصر بھی کچھ نہ کچھ شامل تھا لیکن یہ خیال رکھنے کی بات ہے کہ شروع ہی سے کس طرح زکوۃ کی رقم جماعت میں مساوات پیدا کرنے کے بجائے حکمران طاقت کے ہاتھوں کو مضبوط بنانے میں صرف کیجاتی رہی ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مذہبی انقلاب کا اثر جماعتی نظام پر بھی ضرور پڑتا ہے مگر اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے اس مذہبی خمیر سے جماعت کی ترتیب اور تعمیر کا کام لیا اور اُس تخریبی رجحان کو جو اکثر سیاسی مسائل سے متعلق اس میں پایا جاتا ہے زور نہ پکڑنے دیا۔ بلاشبہ خلافت کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ یہ انقلابی میلان بالکل فنا نہ ہو سکا تھا۔ تاہم بحیثیت مجموعی اسلامی مساوات کی تعلیم حاکم اور محکوم کے تعلقات میں بالکل خلل انداز نہیں ہوئی مذہب، مساوات کا اسی طرح مطالبہ کرتا ہے جس طرح اطاعت امیر کا۔ دونوں پر خلوص کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا اور ایک کو دوسرے کے منافی نہ سمجھا جاتا تھا۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اُس وقت کے باہمی تعلقات کی ابتری کے مقابلے میں جب یہ نیا اور ہلچل پیدا کردینے والا اصول پیش کیا گیا ہوگا تو بے حد پسندیدگی اور انتہا سے زیادہ نفرت کے متضاد جذبے ایک ہی ساتھ مختلف قلوب میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ایک سے زیادہ جملے ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سادہ دل عرب مسلمانوں کے عجیب وغریب جوش کو ان کے باہمی اتحاد کی استواری کو انکی کامل اور بے چون وچرا اطاعت امیر کو اور اسلام سے قبل یا دائرہ اسلام سے باہر کی مقدس چیزوں سے متعلق انکی شان بے نیازی کو کس حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ بعض طبعیتیں ان عجیب و غریب باتوں کی وجہ سے ادھر مائل ہوئیں خصوصاً وہ طبعیتیں جن کے لئے دوسرے اسباب کی بنا پر قدیم تعلقات کو قطع کرنا دشوار نہ تھا لیکن عام طور پر بے دلی کا اظہار کیا گیا حتی کہ مدینہ میں بھی یہ بے دلی عام

(× ×) نسب وخاندان دنیاوی تعلقات سے وابستہ ہیں فضل وکمال کا انحصار صرف تقوی پر ہے۔ البتہ اسلام نے اشتراکیت سے کبھی موافقت نہیں کی۔ بلکہ حق ملکیت کو قائم رکھا۔ اموی زمانہ کا نزاع، اسی طرح عباسی وہاشمی سب جاہلیت کے آثار ہیں۔

(سلہ نوٹ کے لئے دیکھو صفحہ ۵۵)

تھی۔ ایک طبقہ جسے مسلمان "منافقین" کے نام سے یاد کرتے ہیں ایسا بھی تھا جو یا تو پوری طرح رسول کیساتھ نہ تھا یا دل میں انکی مخالفت کے جذبات پوشیدہ رکھتا تھا۔ یہ لوگ کھلے بند دشمنی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ رائے عامہ متحد نہ تھی اور کچھ اس سبب سے کہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں سے یہ لوگ بہت خائف تھے۔ ان لوگوں پر ریاکاری کا جو الزام لگایا جاتا ہے اسکا اصل میں یہ مطلب ہے کہ انہوں نے نئے سیاسی نظام کو بہ تمام وکمال قبول نہ کیا۔ وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہو سکتے تھے کہ خود اپنے شہر میں انہیں ایک نقطہ کہنے کا بھی اختیار نہ ہو اور مکے سے آئے ہوئے رسول اور انکے ساتھیوں کی اطاعت پر انہیں مجبور کیا جائے۔ کچھ دنوں کے لئے تو یہ خطرہ بہت بڑھ گیا تھا کہ کہیں تمام مدینہ (مہاجرین کے علاوہ) منافقت کے جذبے سے متاثر نہ ہو جائے[1]۔ اگر واقعی ہم اسے منافقت کہہ سکیں کہ ایک لمحہ کے لئے فطرت اور خون مذہبی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس کی بندشوں کو توڑ ڈالیں۔ لیکن قوم کے تمام نوجوان افراد بہرحال محمد (صلعم) کی تائید میں پورے جوش کا اظہار کرتے تھے۔ منافق بیشتر صرف سن رسیدہ لوگ تھے اور خصوصاً قبائل کے سردار جن پر اپنی طاقت اور اثر کا زوال بہت گراں

(نوٹ صفحہ ۵۴) بجائے اس کے کہ "عام طور پر" کا لفظ استعمال کیا جاتا اگر "بعض افراد" کہا جاتا تو درست ہوتا، اس لئے کہ عام طور اخلاص وصداقت سے لوگوں نے اسلام کو قبول کیا تھا نہ ریا ونفاق سے۔

[1] مدینہ میں آخر وقت تک بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے اور وہ غور وفکر کرنا چاہتے تھے، ایسوں کو کسی نے نہیں چھیڑا، خود ابن اُبی ذعیرہ نے شروع میں اسلام لانے سے پہلو تہی کی، مگر ان سے کسی نے تعرض نہیں کیا، پھر خود بخود آہستہ آہستہ مسلمان ہو گئے، سورہ ۹/۶ میں بحالت جنگ یہ حکم ہے کہ اگر کوئی مشرک تمہاری پناہ میں آکر کلام اللہ سنا چاہے تو اُسے اچھی طرح سے سنا دو، اور بحفاظت اُس کے امن کی جگہ اُسے پہنچا دو، اس قسم کی بین وروشن دلیلوں کے ہوتے ہوئے پھر منافقین کی موجودہ حالت کو معقولیت وحسریت سے تعبیر کرنا ظلم عظیم وبہتان مبین نہیں تو اور کیا ہے؟

گذرتا تھا۔ منافقوں کے سردار کی حیثیت سے ابن اُبَی کا نام ہمیشہ لیا جاتا ہے، یہ مدینہ کا سب سے بڑا آدمی تھا اور خزرج اس کے سر پر تاج رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن اسلام نے آکر تختہ ہی الٹ دیا۔ محمد (صلعم) نے ابن اُبَی اور اُس کے ساتھیوں سے عموماً چشم پوشی اختیار کی اور یہی روّیہ اُس وقت مناسب بھی ہے جب بجائے مذہبی مسائل کے سیاسی مسائل کا معاملہ ہو اور سوال اصول کا نہ ہو بلکہ طاقت اور اقتدار کا ہو[۱]۔

---

[۱] منافقین سے چشم پوشی کی اصلی بنا اُنکی رعایت یا اُنکی قوت سے خوف ہرگز نہیں تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی طرح ہر قسم کے اسلامی فرائض کے کم و بیش پابند تھے، ہر وقت حاضر باش اور بسا اوقات اپنی محبت و اخلاص کے جذبہ کو زبان سے نمایاں کیا کرتے تھے بعض وقت محض یہود کی باتوں کی نقل یا کنایہ و تعریض کی صورت میں اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے، جو صریحاً کفر کے درجہ پر نہیں پہونچ سکتا تھا، نیز انکے قتل و اخراج سے نفاق کی جڑ کا اور مستحکم ہونا معلوم ہوتا تھا نہ کہ استیصال، کیونکہ جبر و قوت سے اطمینان قلب ممکن نہیں، نہ اسلام کسی وقت ایسے ایمان کا طالب ہوا، نہ کسی ایک کافر و مشرک کو بجبر مسلمان بنایا گیا، پس ان سے چشم پوشی برتی گئی کہ یہ لوگ اپنی حماقتوں پر خود پشیمان ہوں، اور حجت الٰہی سے خود بخود قائل ہو جائیں ایک اور وجہ بھی بعض روایتوں میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کے قتل میں کوئی مصلحت نہیں سمجھی بلکہ عام نفرت کا خیال محسوس کر کے انہیں چھوڑ دیا، یعنی ان پر اگر کفار کے احکام جاری کئے جاتے اور انہیں اُنکی بدی اور نفاق کا واجبی نتیجہ دکھا دیا جاتا تو دوسرے لوگ یہ سمجھتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بدعہدی کرتے ہیں، اور اپنے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کو بے دریغ سزا دیتے ہیں۔

تیسری وجہ ایک اور بھی بیان کیجاتی ہے وہ یہ کہ مسلمان یا ذمی کو بلا ظاہری معقول وجہ کے محض باطنی خباثت نفس کی بنا پر اگر کوئی سزا دیجاتی تو ایک نظام و مثال کا حکم رکھتی، یعنی اس میں دو خرابیاں پیدا ہوتیں ایک یہ کہ معترضین کہہ سکتے تھے کہ خواہ مخواہ اغراض نفسانی کی بنا پر بہت سے مسلمانوں کو بلا کسی معقول وجہ کے سزا دی گئی، بعض ہوا پرست حکام اس سے اپنی اغراض نفسانی کے پورا کرنیکے واسطے (بقیہ)

بلاشبہ رسول کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سلطنت کی بنیاد ایک ایسے جذبۂ اخوت
پر رکھی جو مذہب کا پیدا کیا ہوا تھا۔ مدینے کی جماعت وہ آلہ تھی اور اس جماعت کا محکم یقین او وہ زور
جس سے اسلام نے ایسی کامیابیاں حاصل کیں جو تاریخ عالم میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں
وہ کیا چیز تھی جس نے اسلام میں یہ داخلی قوت اور استحکام پیدا کر دیا تھا۔ اسلامی روایتیں اس
سے بالکل بحث نہیں کرتیں[1] بلکہ وہ صرف اس طاقت کے خارجی مظاہر کے بیان پر اکتفا کرتی ہیں
محمد (صلعم) کے قیام مدینہ کے زمانے کے تمام حالات مغازی رسول اللہ کے تحت میں بیان ہوتے
ہیں۔ مدینہ کے قرب و جوار کے بعض چھوٹے چھوٹے قبائل (جہینہ۔ مزینہ۔ غفار۔ اسلم) اور خزاعہ
کے ساتھ محمد (صلعم) نے صلح و آشتی کا برتاؤ کیا۔ فیاضانہ غیر جانبداری نے بڑھتے بڑھتے اتحاد کی صورت
اختیار کی اور بالآخر یہ سب کے سب مدنی سامراج میں داخل ہو گئے۔ لیکن باقی عرب کے ساتھ خود
انکے اصولوں نے انہیں محاربانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا[2]۔ ٹھیک اسی وقت سے جب[3] سے

(+ +) استدلال کرکے جسے چاہتے قتل کر دیتے، اور کسی قسم کا عہد و ذمہ قابل اعتبار نہ ہوتا۔ پس ان متعدد معقول
وجوہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ کیا جو اسلام و دین ظاہر کرے
یا ہمارے عہد میں آجائے، پھر اس سے کھلم کھلا کوئی ایسا جرم ثابت نہ ہو کہ وہ مستوجب سزا ہو تو اسے ہم
اپنے مخصوص علم کی بنا پر یا محض اتہام و سوءظن کی بنا پر کسی سزا کا مستوجب نہیں سمجھ سکتے"۔ یہ وہ بین اور
روشن حقیقت اور ایسا معقول و عادل قانون ہے کہ دنیا اسکی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

[1] یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن کی تعلیم اور رسول کا اسوۂ حسنہ وہ سبب تھا جس نے مسلمانوں میں
یہ داخلی قوت پیدا کر دی تھی کہی اور سبب کی تلاش کی ضرورت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:- (۳-۱۰۳) و (۸-
۶۲، ۶۳) وغیرہ جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ اتحاد و اتفاق اور اعتصام بحبل اللہ ہر قسم کی
ترقی و قوت کا مرکز ہے۔

[2] یہ نہایت صریح دروغ بیانی اور افترا ہے، کسی اصل اصول نے محاربانہ رویہ پر ہرگز مجبور نہیں (+)

اسلام نے دین کو چھوڑ کر حکومت کا لباس پہن لیا انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کافروں سے جنگ کرکے اسلام کی فضیلت کا ثبوت دیں۔ اصول کی جنگ کو تلوار سے فیصل کرنا پڑا اور اللہ کی حاکمیت مطلق کا اظہار ان لوگوں پر جو اسے ماننے کے لئے تیار نہ تھے ۔جبر و تشدد کے ذریعہ کیا گیا۔ بجائے عیسیٰ کے اگر محمدیہ کہتے تو زیادہ مناسب تھا کہ "میں امن لیکر نہیں آیا ہوں بلکہ تلوار لایا ہوں" اسلام گویا بت پرستوں کے خلاف ایک مستقل اعلان جنگ کی حیثیت رکھتا تھا۔[1]

اعلان جہاد کے لئے مناسب ترین اور قریب ترین جماعت اہل مکہ کی تھی۔ انہیں کے خلاف محمدؐ نے پہلے پہل اس نئے اصول پر عمل کیا کہ اتحاد اور اختلاف کی بنا مذہب ہی نہ کہ رشتہ داری۔ عربی روایات کے لحاظ سے یہ شدید بغاوت کا فعل تھا کہ محمد (صلعم) اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسری جماعت سے جاملے اور اہل مدینہ نے انہیں پناہ دیکر گویا مکہ والوں کے خلاف سخت دشمنی کا اعلان کیا تھا اس لئے اگر اہل مکہ مسلمانوں کے خلاف تلوار اُٹھاتے تو وہ بالکل حق بجانب ہوتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، کچھ تو آرام طلبی اور عیش پسندی کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ وہ آپس کی جنگ سے

(+) کیا، بلکہ خود انہوں نے اپنے غلط رویہ، محاربانہ جد و جہد اور مدینہ پر حملہ کرکے آپ کو مجبور کیا کہ مقابلہ کریں۔

[1] یہ بالکل غلط ہے۔ اسلام نے بت پرستوں کو توحید اور اخلاق حسنہ کی دعوت دی انہیں ان کی خرابیاں دکھلائیں اور اچھائیوں کی طرف بلایا۔ لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ اسکا انہیں اختیار تھا کہ وہ اس حق کی آواز پر لبیک کہتے یا نہ کہتے۔ اسلام نے ان سے بالکل تعرض نہ کیا صرف حق تبلیغ ادا کیا بلکہ اس نے صاف صاف یہ اعلان کر دیا کہ " لا اکراہ فی الدین " وہ تو لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے آیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اعلان جنگ کرکے لوگوں کو اپنے سے بدظن کرتا۔ لیکن بت پرستوں نے صرف حق سے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ اسلام کے داعی اور اس کے نام لیوا غریبوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم کرنا شروع کر دیا۔ اعلان جنگ دراصل انہوں نے اسلام کے خلاف کیا اور اسلام کو مجبوراً مدافعت کے لئے اُٹھنا پڑا چنانچہ رسول اللہ کی جنگوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ " لاتکون فتنۃ و یکون الدین للہ " یعنی کہ تبلیغ حق کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور ہر شخص

احتراز کرنا چاہتے تھے۔ پہل مسلمانوں کی طرف سے ہوئی جنگجوئی انکی فطرت میں تھی[1]۔ مدینہ اس راستہ سے

کو اس کے ماننے نہ ماننے میں کامل آزادی ہو۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ)

[1] مضمون نگار نے دیگر مشنریوں کی طرح اہل مکہ کے حملہ کو حق بجانب قرار دیا ہے، گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اُنکے چور یا غلام تھے جن پر اُنہیں پورے تسلط وحکومت کا حق ہے، عرب کی اس عادت کا ذکر بھی ایک سفید جھوٹ ہے۔ عموماً عرب میں ایسا دستور تھا کہ جس خاندان کے لئے کسی وجہ سے اپنے وطن میں معقول اطمینان نہ ہوتا وہ کسی دوسری جگہ جا کر اقامت کرتا اور وہاں کے باشندوں سے حلف یعنی عہدو پیمان کرلیتا بلکہ بہت سی ایسی نظیریں بھی ملتی ہیں کہ بعض اوقات کوئی قبیلہ یا اُس کا فرد کسی جرم کے ارتکاب کے بعد وہاں سے بھاگ کر دوسرے قبیلہ میں آملتا اور پناہ لیتا تھا۔ اب اس جگہ بغور دیکھئے، ایسا کوئی جرم نہ تھا، محض مظلوم تھے ایسی حالت میں اہل مکہ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ حملہ کرتے بلکہ ان مظلومین کو سراسر حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر مناسب تدبیر سے اپنے ظالموں سے بدلہ لیں، مگر ہرگز ایسا نہیں کیا گیا۔ قریش کی طرف سے پیشقدمی ہوئی اور انہوں نے اہل مدینہ یہود و انصار سے تقاضا کیا کہ یا ان لوگوں کو ہمارے پاس واپس کرو یا ہمارے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس مضمون میں زیادہ استدلال وحجت کی ضرورت نہیں صرف آیتہ جہاد یا آیتہ قتال جس میں سب سے پہلے حکم مدافعت نازل ہوا لکھدینا کافی ہے (۲۲ - ۳۸ سے ۴۱ تک) اسمیں حقیقت واضح کا پورا بیان ہے اور یہ کہ ابتداء کفار کی طرف سے تھی۔ انہوں نے محض مکہ سے نکالنے پر صبر نہیں کیا بلکہ پیش قدمی کرکے جنگ کا سلسلہ شروع کیا۔ اب حیات وممات کا وہ مسئلہ درپیش ہوا جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ وہ آخری اور انتہائی سعی تھی جس میں چار و ناچار مسلمانوں کو داخل ہونا پڑا اور کفار نے دیکھ لیا کہ جو نہتے بے خانماں محض ایک خدا کے ماننے اور اُس کی عبادت کرنے پر ہر قسم کے ظلم کا شکار ہوئے، کس طرح اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آخر کفر کا بادل پھٹا اور اسلام کا سورج روشن ہوا۔ تمام اسلامی جنگوں کی ابتدا اسی نقطہ سے ہوتی ہے۔

قریب جو یمن سے شام کو جاتا ہے ایک بلند جگہ پر واقع ہے۔ محمد (صلعم) نے اس کے مناسب موقع سے فائدہ اُٹھا کر مکی کاروانوں کو روکنا شروع کیا۔ شروع شروع میں تو صرف مہاجرین کو ان مہموں پر بھیجتے رہے اس لیئے کہ اہل مدینہ نے اسی حالت میں انکی حمایت کا عہد کیا تھا جب کوئی باہر سے ان پر حملہ کرے مگر بہت جلد یہ لوگ بھی شریک ہو گئے[1]۔ ابتداءً تو جس چیز نے انہیں اس طرف مائل کیا وہ مال غنیمت کی توقع تھی۔ لیکن اسلام کے زیر سایہ اتحاد عناصر کا جو عمل چپکے چپکے ہو رہا تھا وہ اسقدر کامیاب ثابت ہوا کہ آگے چلکر الگ ہونا انکے لیئے دشوار ہو گیا۔

لوٹ کا سب سے پہلا حملہ رجب سنہ ۲ھ (خزاں سنہ ۶۲۳ء) میں ہوا۔ اس واقعہ سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ نئے مذہب نے لوگوں کے ضمیر میں جو تبدیلی پیدا کر دی تھی اسکا کیا فائدہ ہے رجب میں جنگ اور غارتگری حرام سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس مہینہ کی حرمت پر اعتماد کر کے قریش کا ایک قافلہ شراب چمڑے اور خشک کھجوروں سے لدا ہوا طائف سے مکہ جا رہا تھا لیکن محمد (صلعم) نے کچھ خیال نہ کیا اور مہاجرین کی ایک ٹولی اس غرض سے بھیج ہی دی کہ اس قافلہ پر مکہ اور طائف کے درمیان بمقام نخلہ، اچانک حملہ آور ہو[2]۔ اس سے متعلق تمام احکام انہوں نے ایک سر بمہر پرچے پر لکھ کر دیئے

---

[1] اہل مدینہ کا رسول اور مہاجرین کے ساتھ ملکر کفار کا مقابلہ کرنا اس امر کا قطعی اور بین ثبوت ہے کہ ابتداء جنگ کفار کی طرف سے تھی اس لئے کہ باہمی معاہدے میں صرف مدافعت کی شرط تھی اسکے علاوہ قافلوں کو لوٹنا یا ان کو روکنا پوری طرح ثابت نہیں ہوتا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ لوگ گئے لیکن قافلے ملے نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس غرض سے کبھی گئے ہی نہیں۔ اہل مکہ کے حملوں کی افواہ اڑتی تھی اور تحقیق یا پتہ لگانیکی غرض سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں روانہ کی جاتی تھیں جو اصل واقعہ آ کر بتلا دیتی تھیں۔ سیرت نگاروں نے انہیں بھی سریہ کہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مستشرقین کو اس لفظ سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔

[2] مضمون نگار کا یہ خیال غلط ہے کہ رسول نے ایک ٹولی قافلے پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی تھی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ قریش کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے واسطے یہ لوگ عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تھے (x)

تھے اور کہا تھا کہ یہ پرچہ اس وقت تک نہ کھولا جائے جبتک فوج دو دن کی راہ طے نہ کرلے۔ احکام پر عمل کیا گیا اور یہ تدبیریں اور زیادہ کامیاب ہوئی کہ غارتگروں نے حاجیوں کا سا بھیس بدل لیا تھا لڑائی میں مکہ کا ایک آدمی مارا بھی گیا لیکن اس معاملے میں اپنے ترقی یافتہ مذہبی خیالات کی بدولت محمد (صلعم) نے جس دغابازی (نعوذ باللہ) سے کام لیکر بت پرستوں کی ایک پاک رسم سے غلط فائدہ اُٹھایا اس کے خلاف خود مدینہ میں اسقدر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا کہ انہیں مجبوراً اُن لوگوں سے جو اس حرکت میں انہیں کے آلہ کار تھے برأت کا اظہار کرنا پڑا۔ اسلامی روایتوں میں عام طور پر اس پرچے کے صریح اور کھلے ہوئے مضمون سے انکار کیا جاتا ہے[1]۔

قریش اب بھی چپ رہے۔ ابھی ایک اور ستم ڈھایا جانے والا تھا۔ رمضان ۲ھ (دسمبر ۶۲۳ء) میں انکے بڑے شامی قافلے کی واپسی کی امید تھی چنانچہ محمد (صلعم) نے یہ فیصلہ کیا کہ بمقام بدر جو مدینہ سے شمال میں ایک اچھا پڑاؤ اور پانی کا گھاٹ تھا انکی تاک میں جا بیٹھیں۔ اس غرض سے وہ خود ۳۰۰

(*) ملاحظہ ہو طبری ابن اثیر اور حلبی (سیرۃ ابن ہشام جلد دوم (مطبوعہ مطبع خیریہ مصر ۱۳۲۱ھ) میں صفحہ ۱۹۲ پر اس سربمہر پرچے کے الفاظ منقول ہیں جو یہ ہیں " اذا نظرت فی کتابی ہذا فامض حتی تنزل نخلۃ بین مکۃ والطائف فترصد بہا قریشا وتعلم لنا من اخبارہم" ان الفاظ میں کہیں حملے کا ذکر نہیں ہے بلکہ صاف صاف ان کے احوال کی تفتیش کا حکم ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب یہ لوگ دونوں قیدیوں اور اونٹوں کو لیکر پہنچے اور حالات بیان کئے تو رسول اللہ نے کہا " ما امرتکم بقتال فی الشہر الحرام " اب صاف ظاہر ہوگیا کہ اس قتل کی ذمہ داری رسول اللہ پر نہیں ہے بلکہ یہ عبداللہ بن جحش اور انکے ساتھیوں کا اجتہادی فعل تھا اور انکی اس غلطی پر انہیں ملامت بھی کی گئی اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مقتول عمرو بن الحضرمی کا خونبہا ادا کر دیا تھا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تحقیق الجہاد مولوی چراغ علی صفحہ ۳۷ و ۳۸)

لہ پرچے کا مضمون تو وہی ہے جو تمام کتب سیر میں منقول ہے اور جو اوپر لکھدیا گیا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مضمون تھا تو اس کا ثبوت اس مضمون نگار کو دینا چاہئے تھا محض قیاس سے تو کوئی بات تسلیم نہیں کیجا سکتی۔

آدمیوں کو ساتھ لیکر اس طرف روانہ ہوئے لیکن قافلہ سالار ابوسفیان اموی کو اسکا پتہ چل گیا اور
انہوں نے دوڑا دوڑ ایک قاصد کو مکہ بھیجا کہ وہاں سے جلد کمک لائے۔ اپنے مال و زر کے خیال سے
بالآخر قریش جنگ پر آمادہ ہو ہی گئے اور تھوڑی ہی دیر میں ۹۰۰ جوان بدر کی طرف چل کھڑے
ہوئے راستے میں انہیں یہ خبر ملی کہ قافلہ بدر سے مغرب کی طرف مڑ کر نکل گیا اور اب خطرے سے باہر ہے
بایں ہمہ مخزومی سردار ابوجہل کے کہنے سے اور اپنی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ لوگ آگے بڑھتے ہی
گئے مسلمانوں نے جب انہیں بدر کے قریب پہنچتے دیکھا تو یہی سمجھا کہ قافلہ آرہا ہے حقیقت معلوم کر کے
انہیں جو حیرت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ مشکل نہیں لیکن اپنے سردار کی ہمت اور جرأت کی وجہ سے
وہ جمے رہے اور انہوں نے کثیر التعداد دشمن کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۱۷ رمضان، جمعہ
کی صبح کو لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے تو چند انفرادی مقابلے ہوئے، جن میں بیشتر مسلمان ہی کامیاب
رہے۔ بالآخر اہل مکہ نے جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور دراصل اسکا سبب یہ تھا کہ لڑائی جاری رکھنے
کی کوئی وجہ انکی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ اپنے رشتہ داروں کا خون بہانا نہیں چاہتے تھے۔ اور اپنے اُن
دشمنوں کے جو جانتے تھے کہ وہ کس چیز کے لئے جان دے رہے ہیں، استقلال اور نتائج سے اُن کی
بے پروائی دیکھ کر ان پر ایک طرح کا خوف طاری ہونے لگا تھا جب قریش کے کئی بہادر اور شریف سردار
قتل ہو چکے اور ابوجہل بھی آخر میں قتل ہوا تو باقی قریش بھاگ کھڑے ہوئے[۵]۔ کہا جاتا ہے کہ اس

---

۵ جنگ بدر کا جو سبب مضمون نگار نے بیان کیا ہے صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان سیرۃ نگاروں
نے بھی یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ قریش کے قافلے کی مزاحمت کے لئے تشریف لے گئے تھے لیکن تحقیق سے یہ
بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ واقعات کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ عمرو بن الحضرمی کے قتل سے جو قریش
کے ایک معزز سردار کا لڑکا تھا ان لوگوں کی آتش غضب بہت تیز ہو گئی تھی، ابوسفیان کی سرکردگی میں جو قافلہ
شام سے آرہا تھا اسمیں اسلحہ جنگ بھی کافی تعداد میں تھے اور قریش کا خیال تھا کہ ان اسلحہ کی مدد سے مدینہ
پر حملہ کر کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ فطری طور پر اس قافلہ کا بہت انتظار تھا اور چونکہ قریب قریب تمام

جنگ میں جتنے مقتول ہوئے تقریباً اُتنے ہی قیدی بھی گرفتار ہوئے، قیدیوں میں سے دو آدمی جنہے محمدؐ

قریش کا مال اس کے ساتھ تھا اس لئے ہر شخص کو اسکے بہ حفاظت پہنچ جانیکی فکر تھی۔ اس قافلے کا مدینہ کے قریب ہو کر گزرنا لازمی تھا کیونکہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ مدینہ میں رسول اللہ اور انکے وہ ساتھی تھے جنکے ساتھ قریش نے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس لئے ان سے بھی کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں جب کسی نے یہ غلط خبر مشہور کر دی کہ اہل مدینہ اس قافلے کو روکنا چاہتے ہیں تو قریش کا مضطرب ہو جانا اور اسکی حفاظت کے لئے فوراً روانہ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلعم اور انکے ساتھی قریش کے مخالفانہ رویہ کو روز بروز بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ہر وقت انہیں یہ خوف رہتا تھا کہ اب حملہ ہوا اور تب حملہ ہوا اسی خوف کی بنا پر مختلف اوقات میں پتہ لگانے کے لئے کچھ لوگ بھی بھیجے جا چکے تھے اور انہیں میں سے ایک جماعت کے ساتھ نخلہ کا واقعہ بھی پیش آیا تھا ان حالات میں انہیں قریش کے ۹۰۰ جوانوں کی مکہ سے روانگی کی خبر ملی۔ اب مدافعت لازمی تھی چنانچہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر رسول اللہ بھی مدینے سے نکلے اور بدر کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ قرآن کی شہادت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ سے روانگی قافلے کی مزاحمت کے لئے نہیں ہوئی تھی بلکہ قریش کے مقابلہ کے لئے ملاحظہ ہو:۔

کما اخرجک ربک من بیتک بالحق ص وان فریقاً من المومنین لکارھون ۵ یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون ۵ مسلمانوں کو یہ معلوم ضرور تھا کہ قریش کا ایک قافلہ شام سے آرہا ہے اور ان میں سے بعض کا یہ خیال بھی تھا کہ بجائے فوج کے مقابلے کے اسی طرف کا رخ کیا جائے لیکن رسول اللہ نے اسے پسند نہیں کیا اور قریش کی فوج ہی کی طرف گئے کم از کم قرآن کی شہادت تو یہی ہے۔ واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم و یرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکافرین لیحق الحق ویبطل الباطل ولو کرہ المجرمون ۵ زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی مولٰنا شبلی نعمانی جلد اول۔ غزوہ بدر۔

کو ذاتی عناد تھا[1] قتل کردئے گئے۔ ان کے نام عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن الحارث ہیں جب مؤخر الذکر

---

[1] اس کا ثبوت ملنا چاہئے کہ رسول کو ان لوگوں سے ذاتی عناد کیا تھا۔ یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ اگر کسی نے رسول اللہ صلعم کو کبھی کوئی ذاتی نقصان پہنچایا تو وہ ہمیشہ اُسے معاف کر دیا کرتے تھے ہاں اسلام کی علانیہ مخالفت یا جماعت کے خلاف اگر کوئی جرم ہوتا تھا تو اس کی مقررہ سزا ضرور دیتے تھے۔ کسی جنگ کے بعد اگر رسول اللہ صلعم نے کسی قیدی کو قتل کرنے کا حکم دیا تو وہ محض اس وجہ سے کہ اس نے مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی یا ایک دفعہ جان بخشی کے بعد پھر مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کیا تھا اور اس قسم کے قیدیوں کو قتل کر دینا آج کل بھی اقوام یورپ کے جنہیں اپنے تہذیب و تمدن پر ناز ہے قانون جنگ میں جائز سمجھا جاتا ہے۔ پھر اسی بات پر رسول اللہ کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں تک ایمانداری کے مطابق ہے۔ یہاں تک تو اصول سے بحث تھی لیکن ابھی یہ بھی محتاج ثبوت ہے کہ جن لوگوں کے نام لئے جاتے ہیں وہ واقعی قتل بھی کئے گئے تھے۔ نضر بن الحارث کے قتل کی داستان تو محض افسانہ ہے اس لئے کہ اکثر مورخین نے جنگ حنین (۸ھ) میں نضر کی موجودگی بیان کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اُسے مال غنیمت میں سے سو اونٹ دئے گئے تھے (ابن سعد جلد دوم صفحہ ۱۰۰' زرقانی جلد اول صفحہ ۱۰۵) سر ولیم میور بھی جو غزوۂ بدر کے بیان میں نضر کے ظالمانہ قتل کا رسول پر الزام رکھتے ہیں جنگ حنین کے بیان میں ایک حاشیہ میں اسی نضر کی موجودگی اور اُسے سو اونٹ کا ملنا تسلیم کرتے ہیں۔ اس بیّن تضاد کے بعد بھی مستشرقین کی اس دلیری پر تعجب اور تاسف کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ عقبہ ابن ابی معیط کے قتل کا صاف انکار تو کسی مورخ نے نہیں کیا ہے لیکن اس قتل کے واقعات میں اختلاف اس قدر ہے کہ روایت کمزور ہو جاتی ہے۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ اُسے عاصم بن ثابت نے قتل کیا، ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضرت علی نے، کوئی کہتا ہے کہ وہ مصلوب ہوا کوئی کہتا ہے کہ سر کاٹا گیا۔ اس کے علاوہ اسی وقت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ابو عزہ جو اسیران بدر میں سے تھا اور جو مسلمانوں کو ایذا دہی میں بہت پیش پیش تھا رحم کی درخواست کرتا ہے اور چھوڑ دیا جاتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر زیادہ تقویت اسی خیال کو پہنچتی ہے کہ عقبہ کا قتل بھی افسانہ

نے رسول کی خشمگیں نگاہ سے یہ اندازہ کرلیا کہ اس کی جان خطرے میں ہے تو اس نے اپنے ایک پرانے دوست سے جواب مسلمان تھا درخواست کی کہ وہ اسے اپنی امان میں لیلے۔ جب اس دوست نے انکار کیا تو نضر یوں گویا ہوا "اگر قریش تمہیں قید کرلیتے تو تم ہرگز میرے جیتے جی قتل نہ کئے جا سکتے تھے" اسکا معذرت آمیز جواب یہ ملا کہ "مجھے اس میں بالکل شک نہیں لیکن اب میری حالت تم سے بہت مختلف ہے اس لئے کہ اسلام نے تمام پرانے رشتے توڑ ڈالے ہیں"۔ باقی قیدی ان کے رشتہ داروں سے فدیہ کی بڑی بڑی رقم لیکر چھوڑ دئے گئے۔ لیکن جیسا کہا جاتا ہے۔ بعد میں محمد (صلعم) نے اپنے نفس کو اس امر پر بہت ملامت کیا کہ دنیاوی فائدے کے خیال نے انہیں کیوں ان سب کو واصل جہنم کرنے سے باز رکھا حالانکہ وہ اسی کے مستحق تھے[1]۔

جنگ بدر مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ شاندار جنگ ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخی حیثیت سے بھی وہ بہت اہم ہے۔ اس لڑائی سے محمد (صلعم) کا اقتدار اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اب مدینہ میں انکی علانیہ مخالفت ناممکن تھی۔ وہ خاندان جو ابتک انکے حلقہ اثر سے باہر تھے بعض ان سفاکانہ قتل سے ڈر کر جو محمد (صلعم) کے حکم سے عمل میں آئے تھے اسلام کے دائرے میں آگئے[2]۔ اب گویا وہ

ہے اگر بالفرض اسکا قتل پایہ ثبوت کو پہنچ بھی جائے تو کس قانون کے مطابق کوئی ایماندار آدمی رسول اللہ کو اس فعل کو بے رحمی پر محمول کر سکتا ہے۔

[1] اس سے مضمون نگار کو غالباً قرآن کی اس آیت کیطرف اشارہ کرنا منظور ہے:۔ ماکان لنبیّ ان یکون له اسرٰے حتٰی یثخن فی الارض ط . . . . اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگ میں کافی خونریزی سے پہلے قیدی نہیں بنانا چاہئے تھا لیکن یہ تو کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اسیر کرلینے کے بعد انہیں فدیہ لیکر چھوڑنا نہیں چاہئے تھا بلکہ قتل کردینا چاہئے تھا۔

[2] یہ صریح بہتان ہے کہ کچھ لوگ سفاکانہ قتل سے ڈر کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اس قسم کے قتل سے رسول اللہ صلعم کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ تفصیل سے یہ بحث آگے آئے گی۔

اس قابل ہوگئے تھے کہ یہود کا زور توڑنے کی کوشش شروع کر سکیں سب سے پہلے انہوں نے کمزور بنو قینقاع کیطرف توجہ کی اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کیا انکے انکار کے بعد سب سے پہلا موقع ہاتھ آتے پر انہوں نے انکے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ایک مختصر محاصرے کے بعد ان بیچاروں نے مجبوراً ہتھیار ڈال دئے اور انکے لئے یہ شکر کا مقام تھا کہ ان کے پرانے حلیف ابن ابی نے بمشکل رسول کو اس امر پر راضی کرلیا کہ ان لوگوں کی جان بخش دیں اور انہیں مدینہ سے نکال دینے پر قناعت کریں[1]۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوسرے صدمے پہنچائے گئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ محمد (صلعم)

---

[1] یہود کے ساتھ رسول اللہ نے جو سلوک کیا اسپر مضمون نگار نے جو اعتراضات کئے ہیں ان پر غور کرنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مضمون نگار خود بھی یہودی ہے۔ عرب کے یہودی قبائل سے اس کی ہمدردی پر نہ تعجب کیا جا سکتا ہے اور نہ اعتراض۔ لیکن تحقیق اور غیر جانبداری کے دعادی کے بعد اگر محض تعصب سے کوئی بات کہی جائے تو اس پر افسوس ضرور ہوتا ہے۔ بنی قینقاع کو محض جلاوطن کرنا تو رسول اللہ کے رحم وکرم کی کھلی ہوئی دلیل ہے اس لئے کہ انکا جرم بہت بڑا تھا اور آجکل متمدن سے متمدن قوم بھی اس معمولی سزا پر قناعت نہیں کرتی۔ یہ مسلم ہے کہ مدینہ آنے کے بعد رسول نے تمام قبائل یہود سے معاہدے کئے تھے اور ان سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ انہیں چین سے بیٹھنے دینگے مگر یہود نے اپنی فطری بدطینتی سے کام لیکر بجتیرا انہیں اذیتیں پہنچائیں اور اہل مکہ کا ساتھ دیکر انہیں برباد کرنیکی کوششیں کیں اس میں بنو قینقاع کے قبیلے نے باقی قبائل سے سبقت کی ابن ہشام کا بیان ہے (جلد دوم صفحہ ۳۳۴) کہ:۔ "ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا بینہم وبین رسول اللہ وحاربوا فیما بین بدر واحد" دوسرے قبائل زیادہ تر زراعت پیشہ تھے لیکن بنو قینقاع سب کے سب صناع تھے اور انہیں اپنے اسلحہ اور قلعوں پر بہت ناز تھا۔ بدر کے واقعہ کے بعد انکا بغض اور بڑھ گیا اور انہوں نے علانیہ اظہار مخالفت شروع کر دیا۔ ابن سعد نے قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے: "فلما کانت وقعۃ بدر اظہروا البغی والحسد ونبذوا العہد والمرۃ" ایک اتفاقی سبب بھی پیش آگیا۔ ایک دفعہ اسی قبیلہ کے کسی یہودی نے ایک مسلمان عورت کو چھیڑا۔ ایک مسلمان مرد نے اسے

نے ان چند یہودیوں کو جن سے انکو سب سے زیادہ نفرت تھی خفیہ طور پر قتل کرا دیا اور اس طرح انبار راستہ صاف کرلیا۔ انہی میں کعب[ل] بن الاشرف اور ابن سنینہ[ل] بھی تھے۔ باقی ماندہ آدمیوں پر جو خوف طاری

روکنا چاہا لیکن وہ نہ مانا۔ بات بڑھی اور دونوں میں لڑائی ہوگئی۔ یہودی مارا گیا۔ دوسرے یہودیوں نے ملکر اس مسلمان کو مار ڈالا۔ دوسرے مسلمانوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی پہنچ گئے اور ایک جنگ سی شروع ہوگئی۔ رسول اللہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے بیچ بچاؤ کیا اور بنو قینقاع سے مصالحت کی گفتگو کرنی چاہی لیکن وہ لوگ بہت گستاخی سے پیش آئے اور انہیں سے بعض نے کہا کہ "تم کو بدر کی فتح پر بڑا ناز ہے۔ قریش لڑنا نہیں جانتے تھے، ہم سے مقابلہ کرو تو معلوم ہو جائے"۔ رسول اللہ خاموش ہو کر چلے گئے۔ ان حالات میں اگر رسول اللہ نے انکا محاصرہ کیا تو کیا قصور کیا۔ پھر خود انہیں کی درخواست پر اور انکے حلیف کی سفارش پر انہیں مدینہ چھوڑ دینے کی اجازت دیدی اور کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچایا۔ اتنی اذیت پانے کے بعد اس رحم کا برتاؤ بجز ایک نبی کے اور کون کر سکتا ہے۔ اہل انصاف اگر غور کریں تو خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ (زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام (جلد دوم صفحہ ۴۳۳ تا ۴۳۶) سیرۃ النبی مولانا شبلی (جلد اول صفحہ ۳۶۳ تا ۳۷۱) اور اسپرٹ آف اسلام مصنفہ سید امیر علی (صفحہ ۷۴، ۷۵)

[ل] کعب بن اشرف، بنی نضیر کے با اثر لوگوں میں تھا۔ جنگ بدر کے بعد مکہ جاکر اس نے مسلمانوں کے خلاف قریش کو بہت اُبھارا تھا۔ بنو نضیر مسلمانوں سے دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے اور کعب کا یہ فعل قانون جنگ اور قانون اخلاق دونوں کے لحاظ سے شدید ترین سزا کا مستوجب ٹھیراتا تھا۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں کوئی باقاعدہ عدالت یا پولیس نہیں تھی پھر بھی مدینہ کی عام جماعت نے اسے ملزم قرار دیدیا تھا اور قانون کی حفاظت سے باہر کردیا تھا۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق ایک ایسے شخص کو جو رائے عامہ کی عدالت میں باغی اور عہد شکن ثابت ہو چکے قتل کر دینے کا ہر شخص مجاز تھا۔ معترضین کو ذرا اس طرف بھی توجہ کرنی چاہئے کہ انگلستان میں بھی جو تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کر چکا ہے ابتک یہ قانون موجود ہے کہ جو مجرم قانون کی حفاظت سے باہر کردیا گیا ہو (outlaw) اسے ہر شخص گرفتار کر سکتا ہے اور (ملاحظہ ہو صفحہ ٦٨)

ہوا ہوگا اسکا اندازہ پوری طرح کیا جا سکتا ہو۔ چنانچہ وہ لوگ رسول کے پاس آئے اور ان سے رحم کے

مقررہ سزا دے سکتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے کسی مخصوص آدمی کو کعب بن اشرف کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔
یہ ضرور تھا کہ اسکی دغابازیوں اور سازشوں کی بنا پر انہیں جو تکلیف پہنچی تھی اور جو خطرہ ہر وقت لگا رہتا تھا اسکا
اظہار مجمع عام میں کر دیا تھا اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہو۔ ایسی حالت میں خفیہ طور پر قتل کرانے کا
الزام رسول اللہ صلعم پر رکھنا حق اور انصاف کا خون کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مسلمان نے اسکو
قتل کیا لیکن یہ اسکا انفرادی فعل تھا اور اس کی ذمہ داری کسی طرح رسول اللہ پر عائد نہیں ہو سکتی۔
مزید برآں اگر اس واقعہ پر اُن حالات کی روشنی میں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں غور کیا جائے تو اس شخص
پر بھی جس نے کعب کو قتل کیا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ کعب سزاوار قتل تھا اور مدنی سامراج کا ہر رکن
اس کو قتل کرنیکا مجاز تھا۔ (یہی اس زمانے کا قانون تھا اور یہی آج بھی "متمدن" اور "مسیحی" یورپ کا
قانون ہے) اس کے شر سے مدینہ کی عام جماعت کو محفوظ رکھنے کے لئے اگر کسی ایسے شخص نے جسے اس کا
اختیار بھی حاصل تھا اُسے قتل کر دیا تو کیا جرم کیا۔ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ ہرگز قابل اعتراض
نہیں ہے۔ تعصب کی اور بات ہو، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تحقیق الجہاد صفحہ ۹، تا ۱۰ اور اسپرٹ آف
اسلام صفحہ ۳، و ۴، اور سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲، ۳ تا ۵، ۲)

۵۲ (نوٹ صفحہ ۶۷) ابن سنینہ کے قتل کی روایت تحقیق سے ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک معمولی تاجر تھا
اور کوئی نمایاں عزت یا اقتدار نہیں رکھتا تھا۔ بفرض محال اگر رسول اللہ صلعم لوگوں کو خفیہ طور پر قتل بھی کرا دیا
کرتے تھے جیسا کہ عام مستشرقین کا خیال ہے تو ابن سنینہ کو قتل کرانے سے انہیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا
کہا یہ جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے یہ عام حکم دیدیا تھا کہ جو یہودی جہاں ملے اسے قتل کر دیا جائے چنانچہ ایک
مدنی نے جسکا نام محیصہ تھا ابن سنینہ کو قتل کر دیا۔ لیکن یہ عام حکم کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ سر ولیم
میور بھی جنہیں ضعیف روایتوں کے پیش کرنے میں خاص مہارت حاصل ہو اسمیں تھوڑا سا شک کرتے ہیں
اس کے علاوہ محیصہ اور اس کے بھائی حویصہ کا جو مکالمہ اس قتل کے بعد بیان کیا جاتا ہے بعینہ وہی مکالمہ

خواستگار ہوئے۔ پہلے اگر ان لوگوں کی نفرت ظرافت یا حقارت آمیز جملوں کی صورت میں ظاہر ہو جایا کرتی تھی تو اب کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ یہ لوگ دب کر چپ چاپ بیٹھ گئے اور اس نفرت کو اپنے آپ ہی تک محدود رکھنے لگے۔

اہل مکہ پر بھی اس شکست کا جو انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں نصیب ہوئی تھی بہت اثر پڑا تھا۔ انہوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کا بدلہ لینا نہایت ضروری ہے چنانچہ انہوں نے حملے کی تیاریاں زور شور سے شروع کر دیں۔ ایک سال کے بعد جب انکے انتظامات مکمل ہو گئے اور انکے تمام ساتھی جمع ہو گئے تو ابو سفیانؓ کی سرکردگی میں وہ لوگ روانہ ہوئے اور بغیر کسی مخالفت کے مدینہ کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے شمال مغرب میں جبل اُحد کے پاس کھیتوں میں خیمہ زن ہوئے۔ مدینہ کے بڑے بوڑھوں کی یہ رائے تھی کہ شہر میں رہکر حملے کا انتظار کریں اور یہیں بیٹھے بیٹھے اپنی حفاظت کی تدبیریں کریں لیکن نوجوانوں کی جلد بازی سے رسول نے باہر نکل کر دشمن کا سامنا کرنیکا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ ہو چکنے کے بعد وہ اسی پر قائم رہے باوجودیکہ جن لوگوں نے ان سے اصرار کیا تھا وہ اپنی رائے بدل چکے تھے۔ شنبہ، ۷ شوال ۳ھ (جنوری یا فروری ۶۲۵ء) کو دونوں فوجیں میدان میں آئیں۔ شروع شروع میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج بھی کامیابی مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہے گی۔ دشمن کے لوا بردار اور بہادر سپاہی یکے بعد دیگرے گرتے گئے فوج کے قدم ڈگمگائے اور انکے خیموں پر قبضہ بھی ہو گیا۔ لیکن اس موقع پر مال غنیمت کی چاٹ نے مسلمانوں کو تباہ کیا۔ محمد (صلعم) نے میسرہ پر تیر اندازوں کو کمی سواروں کے مقابلہ میں متعین کر دیا تھا اور انہیں یہ حکم دیدیا تھا کہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ لیکن تیر اندازوں نے جب یہ دیکھا کہ دشمن کے خیموں پر قبضہ ہو گیا تو انہوں نے

ایک دوسرے واقعہ کے بعد بھی بیان کیا جاتا ہے (ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۳۴۴ و ۳۴۵) اس قسم کے اختلاف اور ضعف کی موجودگی میں روایت کا قبول کرنا اور اس کے بعد شدید الزام بھی قائم کر دینا بجز "انصاف پسند" اور "محقق" مستشرقین کے اور کس کے بس کی بات ہے۔

تمام احکام کو بھلا دیا اور لوٹ میں حصہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ کر چلدئے ۔ اس طرح کی سواروں کو موقع مل گیا کہ وہ مسلمانوں کے عقب میں حملہ کر کے اس فتح کو جو قریب قریب حاصل ہو چکی تھی ان سے واپس چھین لیں ۔ اب ایسی کھلبلی مچی کہ خود محمد (صلعم) کے چہرہ پر بھی زخم لگا اور تھوڑی دیر تک بالکل مردے کی طرح زمین پر پڑے رہے ۔ مقتولوں میں انکے چچا حمزہ بن عبد المطلب (شیر خدا) بھی تھے ۔ انکا جگر کٹوا کر ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے اپنے پاس منگا لیا اس لئے کہ بدر میں اس کے باپ عتبہ کو حمزہ نے قتل کر دیا تھا باینہمہ مکہ والے اس فتح سے فائدہ نہ اٹھا سکے ۔ بجائے اس کے کہ وہ فوراً مدینہ پر حملہ کر دیتے جہاں غالباً ابن اُبَی اور اس کے ساتھیوں سے جو شہر میں رہ گئے تھے اور اُحد کے میدان میں نہیں آئے تھے ایک اور جنگ کرنی پڑتی ، انہوں نے کامیابی کے نام ہی پر قناعت کی اور گھر کا راستہ لیا ۔ چلتے چلتے وہ محمد (صلعم) کو آئندہ سال بدر کے مقام پر دوسرے مقابلے کی دعوت دیتے گئے محمد (صلعم) نے دوسرے دن ان لوگوں کا حمرا الاسد تک ، جو وہاں سے تھوڑی دور ہے ، تعاقب بھی کیا ۔ ظاہر ہے کہ صرف دکھانے کے لئے ، تاکہ عرب یہ نہ سمجھیں کہ اس شکست سے انکی ہمت چھوٹ گئی ہے[۱۵]۔

---

[۱۵] معلوم نہیں اس آخری فقرے سے جو ایک معترضانہ انداز رکھتا ہے مضمون نگار کا کیا مقصد ہے ۔ اگر محض اسی غرض سے رسول نے قریش کا تعاقب کیا تو یہ کیا بری بات تھی ۔ تمام دنیا کے قائدین افواج اپنی قوت کے مظاہرے کے لئے مختلف قسم کے طریقے ہمیشہ سے استعمال کرتے آئے ہیں اور کوئی سمجھدار سپہ سالار کبھی یہ نہ چاہیگا کہ اپنی فوج کی کمزوری دشمن پر ظاہر ہونے دے ۔ پھر جنگ احد میں قریش کو پوری فتح بھی حاصل نہیں ہوئی تھی ان کی بڑی تعداد تو بھاگ چکی تھی ۔ بعض مسلمانوں کی غلطی سے قریشی فوج کے ایک حصہ کو اتفاقاً یہ موقع مل گیا کہ مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچائے ۔ اس کے بعد وہ بھی پسپا کر دئے گئے ۔ اس طرح جنگ احد میں یہ فیصلہ ہی نہ ہو سکا کہ کس کے ہاتھ فتح رہی ۔ واقعہ یہ ہے کہ حمرا الاسد تک تعاقب اسوجہ سے کیا گیا تھا کہ یہ خبر ملی تھی کہ قریش وہاں رک گئے ہیں اور دوبارہ حملہ آور ہونیکا ارادہ رکھتے ہیں لیکن یہ خبر غلط ثابت ہوئی ۔

بدر میں دوسرے مقابلے کی تجویز پر عمل نہ ہو سکا اس لئے کہ اہل مکہ موقع پر نہ آئے۔ سنہ ۴ھ کا اہم واقعہ بنو نضیر کا جو مدینہ میں سب سے زیادہ بااثر اور طاقتور یہودی قبیلہ تھا، اخراج تھا (موسم گرما ۶۲۵ء)۔ محمد (صلعم) نے کسی معمولی سی بات پر ان سے تعلقات قطع کر لئے[لے] اور انہیں یہ حکم دیدیا کہ وہ

[لے] یہود بنی نضیر کا معاملہ بالکل وہی تھا جو بنی قینقاع کا تھا اس لئے انکے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا گیا۔ جنگ بدر کے بعد بنو نضیر کے بعض افراد نے مکہ جا کر قریش کو جنگ کے لئے ابھارا۔ قریش نے بنو نضیر کو یہ کہلا بھیجا تھا کہ مسلمانوں کا استیصال کر دو ورنہ ہم آ کے تمہیں بھی برباد کر دیں گے۔ بنو نضیر کا قبیلہ بہت طاقتور تھا اور مضبوط قلعوں کا مالک تھا۔ مدینہ کے حدود میں ایک ایسی جماعت کی موجودگی جو ابتدا سے مخالفت پر کمربستہ تھی۔ مسلمانوں کے لئے از حد خطرناک تھی۔ جنگ اُحد کے بعد رسول اللہ نے یہود کے دو باقی ماندہ قبائل یعنی بنو نضیر اور بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کرنی چاہی تاکہ اگر قریش پھر حملہ کریں تو مسلمانوں کو اس طرف سے تو کم از کم خطرہ نہ رہے۔ بنو قریظہ نے تو تجدید کر لی لیکن بنو نضیر نے انکار کر دیا اور اپنے قلعوں میں بند ہو گئے ایسی حالت میں رسول اللہ کا یہ فرض تھا کہ اپنی حفاظت کے لئے یا تو انہیں معاہدے پر مجبور کریں یا ان سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ اس قسم کے واقعات دنیا کی ہر حکومت کو ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں اور کوئی قوم بھی اسے کسی طرح پسند نہیں کر سکتی کہ اپنے پہلو میں ایک دشمن کو رہنے دے اور ہمیشہ خطرے میں مبتلا رہے۔ پھر رسول اللہ نے فوراً حملہ نہیں کر دیا بلکہ پہلے صلح اور معاہدہ کی گفتگو کی۔ جب بنو نضیر کسی طرح راضی نہ ہوئے تو مجبوراً جنگ کرنی پڑی بنو نضیر کی سرکشی کی وجہ یہ تھی کہ منافقین مدینہ نے انہیں خفیہ مدد پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ رسول اللہ نے پندرہ دن تک محاصرہ رکھا۔ جب یہود کو خارجی مدد سے بالکل ناامیدی ہو گئی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دئے اور یہ شرط پیش کی کہ انہیں اپنا مال اسباب لیکر چلے جانے کی اجازت دیجائے۔ رسول اللہ نے بخوشی انہیں یہ اجازت دیدی۔ معترضین کو یہاں پر غور کرنا چاہئے کہ اگر رسول اللہ ظلم کرنا ہی چاہتے تھے اور ہمیشہ ظلم کرتے آئے تھے تو اس وقت تمام بنو نضیر کو تہ تیغ کر دینے سے انہیں کون روک سکتا تھا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ باوجود انکی بد عہدیوں کے انہیں بہ کمال حفاظت اپنی تمام منقولہ جائداد کو ساتھ لیکر چلے جانے دیا۔ اس (بقیہ)

روز کے اندر شہر خالی کردیں ورنہ موت کے لئے تیار ہو جائیں۔ ابن ابی کی مدد پر بھروسہ کرکے یہود نے مقابلے کی ٹھیرائی۔ اور اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے لیکن جس حلیف پر انہوں نے اعتماد کیا تھا وہ نہایت بزدل ثابت ہوا اور انہیں بہت جلد مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ بارے انہیں اس کی اجازت مل گئی کہ اسلحہ کے علاوہ اپنی تمام منقولہ جائداد ساتھ لیکر فوراً وہاں سے کوچ کر جائیں۔ خیبر کے ارادے سے جہاں انکی جائداد تھی یہ لوگ مدینے کی گلیوں سے اس شان سے گذرے کہ عورتیں چکدار کپڑے پہنے ہوئے تھیں، ٹبل پر چوٹ پڑ رہی تھی اور گانے کی آواز فضا میں چھا گئی تھی۔ یہود کی زمین پر رسول نے خود قبضہ کر لیا[۵] (سورہ ۵۹-۷) تاکہ اس کی آمدنی سے وہ مطالبات ادا کئے جاسکیں جو آئے دن اُن پر عائد ہوتے رہتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک حصہ انہوں نے مہاجرین کو دیدیا کیونکہ مدینہ میں اب تک اُنکے پاس کوئی زمین نہ تھی۔

اس زمانے میں بنونضیر خیبر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ تھے بلکہ اُنہوں نے اپنے جانی دشمن کو فنا کر دینے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ بالآخر اسلام کو دبانے کے لئے وہ قریش سلیم اور غطفان کو متحد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ذوالقعدہ ۵ھ (مارچ ۶۲۷ء) میں یہ تینوں فوجیں جن میں دس ہزار جوان تھے ابوسفیان کی سرکردگی میں روانہ ہوئیں۔ محمد (صلعم) کو اس کی خبر خزاعہ کے ذریعے جو چپکے چپکے ان سے مل گئے تھے معلوم ہوئی۔ انہوں نے اس دفعہ پہلے کیطرح کھلے میدان میں مقابلہ کرنیکا ارادہ نہ کیا بلکہ قلعہ بند ہونیکی تیاریاں شروع کردیں۔ شہر کے اکثر مکانات ایک دوسرے سے اس

(بقیہ) سے زیادہ رحم کا برتاؤ اور کیا ہو سکتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تحقیق الجہاد صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹ اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۷۲-۷۵، سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۳۷۵-۳۷۹)

۵؎ بنونضیر زمین باندھ کر ساتھ تو لیجا نہ سکتے تھے۔ جو چیزیں وہ لیجا سکتے تھے انیں سے تو رسول نے کچھ نہیں لیا پھر کیا مضمون نگار کا یہ مقصد ہے کہ رسول اس زمین کو یونہی بیکار چھوڑ دیتے۔ اس قسم کا انداز تحریر باوجود تحقیق اور انصاف کے دعاوی کے بہت زیادہ قابل انسوس ہے۔

قدر قریب واقع ہوئے تھے کہ ان سے خود بخود ایک مسلسل دیوار بن گئی تھی۔ صرف شمال مغرب کی سمت ایسی کھلی جگہ تھی جہاں سے دشمن بآسانی داخل ہو سکتا تھا۔ اس طرف محمد (صلعم) نے ایرانی ہوئے سلمان کے مشورے سے اور انہیں کی نگرانی میں ایک خندق کھدوائی اور اس کی آڑ میں تمام مسلمانوں کو لیکر ایک مورچہ بنایا۔ انکے عقب میں حفاظت کے لئے سلع کی پہاڑی تھی۔ یہ خندق جس نے بڑی شہرت حاصل کرلی ہے اور جس کی وجہ سے اس معرکے کا نام ہی جنگ خندق ہو گیا ہے، بہت کام آئی۔ دشمن کے سواروں نے بار بار اس مقام پر حملہ کیا لیکن خندق کی حفاظت اس بہادری اور ہوشیاری کے ساتھ کیجاتی تھی کہ انہیں ہر بار پسپا ہونا پڑا۔ آخر کار تھک کر وہ اس طرف کامیابی سے بالکل مایوس ہوگئے الا یہ کہ بیک وقت کسی دوسری سمت سے بھی حملہ میں فتح نصیب ہو۔ اس کوشش میں مدد کرنے کے لئے انہوں نے قریظہ کو، جو مدینہ میں آخری خودمختار قبیلہ رہگیا تھا اور جسکا مسکن شہر کا جنوبی مشرقی حصہ تھا، ابھارنا چاہا۔ بنو نضیر کے سردار حُیَی بن اخطب نے جو محمد (صلعم) کے خلاف اس اتحاد کا سب سے بڑا حامی تھا قریظہ کو ہموار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور آخر کار انہیں اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ غیر جانبدار رہنے کا جو معاہدہ تھا اُسے توڑ دیں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہود کو قریش اور انکے حلیفوں کے استقلال میں شک تھا۔ انہیں یہ خوف ہوا کہ اگر اس جنگ نے طول کھینچا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ محاصرین انہیں اس بلا میں پھنسا کر واپس چلے جائیں۔ چنانچہ یہود نے یہ مطالبہ کیا کہ انکے پاس قریش کے چند آدمی ضمانتاً رکھدئے جائیں تاکہ وہ یہ حرکت نہ کرسکیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کرلیا کہ اگر انکی یہ شرط پوری کی گئی تو وہ جنگ میں شریک ہوکر محمد (صلعم) سے رہی سہی امید پر بھی پانی نہ پھیرینگے۔ انکے اس رویہ سے دوسری طرف محاصرین کو یہ باور کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ یہود چند عربوں کو اس غرض سے مانگتے ہیں کہ انہیں محمد (صلعم) کے حوالے کرکے ان سے صلح کرلیں۔ خندق پر لگاتار حملوں کی ناکامی سے زیادہ اس گفت و شنید نے انکی سرگرمیوں پر ٹھنڈا پانی ڈالدیا۔ موسم بھی انکا مخالف تھا۔ ہوا بہت تیز چلا کرتی تھی۔ راتوں کو بے انتہا سردی پڑتی تھی اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ کھیتوں میں کوئی پیداوار نہ ہوئی تھی۔ ان وجوہ سے زیادہ

خراب حالت اُن بدویوں کی تھی جو اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے لئے چارہ ساتھ لیکر نہیں آئے تھے۔ محمد (صلعم) نے جنہیں بظاہر ان لوگوں کی ذہنی کیفیات کی پوری پوری خبر ملتی رہتی تھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان لوگوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی۔ یہ گفتگو بہت جلد ختم کر دی گئی اور یہی ارادہ بھی تھا لیکن محض اتنی بات کہ غطفان نے مسلمانوں سے کسی قسم کی گفت و شنید کی اتحادیوں کے دلوں میں ایک دوسرے کیطرف سے شبہات پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔ ایک رات کو جب طوفان چل رہا تھا اہل مکہ نے یک بیک محاصرہ اٹھالیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ انکے پیچھے پیچھے سلیم اور غطفان بھی چلدیئے۔ دوسرے دن صبح مسلمانوں کو یہ معلوم کرکے کہ دشمن چلے گئے کوئی معمولی خوشی نہیں ہوئی۔ انکے لئے زیادہ عرصہ تک جمے رہنا ممکن نہ تھا ان میں بالکل دم نہ رہا تھا کچھ تو بھوک اور سردی کی شدت سے اور زیادہ تر شب و روز پہرے پر کھڑے رہنے کیوجہ سے۔ جوں ہی کہ محمد (صلعم) نے انہیں سلع کے دامن سے کوچ کرنیکا حکم دیا وہ بکمال سرعت منتشر ہوکر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

لیکن انہیں آرام کرنیکا زیادہ موقع نہ ملا۔ ابھی وہ مشکل سے اپنے اپنے گھر پہنچے تھے کہ محمد (صلعم) نے انہیں غدار، قریظہ پر حملہ کرنے کے لئے دوبارہ بلالیا۔ یہ بدقسمت یہودی اتحادیوں کے واپس چلے جانیکی وجہ سے تلوار کے گھاٹ چڑھنے کے لئے بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ چودہ دن کے محاصرے کے بعد انہیں بلا کسی شرط کے اپنے آپ کو حوالے کرنا پڑا۔ مرد قید کرکے اسامہ بن زید کے گھر بھیجدیے گئے جہاں دوسرے دن صبح کو محمد (صلعم) نے انہیں ایک ایک کرکے مدینہ کے بازار میں بھجوایا اور وہاں قتل کرا دیا۔ یہ سلسلہ رات تک جاری رہا۔ انکی تعداد چھ سو سے لیکر سات سو تک رہی ہوگی اور انہیں میں جنگ خندق کا بانی حیئ بن اخطب بھی شامل تھا جس نے اہل مکہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور قریظہ کی قسمت میں خود بھی شریک ہونیکی غرض سے اُن سے آملا تھا۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو اسلام قبول کرکے اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے موت کو ترجیح دی۔ شہادت کی اس سے زیادہ شاندار مثال تاریخ میں نہیں ملتی[۵۷]۔ عورتیں اور بچے غلام بنانے کے لئے فروخت کر دئے گئے۔ صرف ایک نوجوان عورت

---

[۵۷] بنو قریظہ کے ساتھ رسول اللہ صلعم نے جو سلوک کیا اس پر مستشرقین عام طور پر شدید اعتراض کرتے ہیں سب

بنانہ جس نے ایک مسلمان کے سر پر محاصرے کے دوران میں اوپر سے چکی کا پاٹ گرا دیا تھا، قتل کی

سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ بنو قریظہ کا جرم کیا تھا۔ رسول اللہ جب مدینے آئے تھے اس وقت انہوں نے دوسرے یہودی قبائل کے ساتھ ساتھ بنو قریظہ سے بھی دوستانہ معاہدہ کیا تھا، انکو کامل مذہبی آزادی بخشی تھی اور جان و مال کی حفاظت کا باہم اقرار ہوا تھا۔ بنو نضیر کے جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ نے تجدید معاہدہ بھی کی، باوجود ان باتوں کے جنگ خندق میں انہوں نے مسلمانوں سے دغا کی اور ایسے نازک وقت پر دشمنوں سے مل گئے کہ اگر ان لوگوں کو کامیابی ہو جاتی تو اسلام کا نام صفحہ ہستی سے مٹ ہی گیا ہوتا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں نے یہ خیال کرنے میں کیا غلطی کی کہ مدینہ کے قرب میں بنو قریظہ کا وجود انکی زندگی اور امن کے لئے سخت مہلک ہے جنگ خندق کے ختم ہونے کے بعد رسول اللہ صلعم نے چند آدمیوں کو بنو قریظہ کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ ان سے انکے اس رویہ کا سبب معلوم کریں لیکن بنو قریظہ نے ملنے سے انکار کر دیا اور بعض افراد نے رسول اور مسلمانوں کے متعلق ناگفتہ بہ الفاظ زبان سے نکالے۔ صورت حالات جب یہ تھی تو مسلمانوں کے لئے سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ بنو قریظہ کے قلعے کا محاصرہ کرتے چنانچہ محاصرہ کیا گیا اور آخر کار تنگ آکر ان لوگوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ اب رہا یہ سوال کہ انکو بھی وہی سزا کیوں نہ دی گئی جو بنو قینقاع اور بنو نضیر کو دی گئی تھی۔ اس کی ذمہ داری رسول پر نہیں آتی۔ خود بنو قریظہ نے یہ درخواست کی تھی کہ سعد بن معاذ رض کو جو انکے حلیف تھے انکا فیصلہ کرنے کی اجازت دیجائے، انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ مرد جو لڑائی کی قابلیت رکھتے ہوں قتل کئے جائیں۔ بغاوت کی یہ سزا کوئی غیر معمولی سزا نہیں ہے۔ رسول اللہ سے پہلے کے زمانہ کو چھوڑ دیجئے ممکن ہے تہذیب و تمدن کے مدعی اسے تاریکی کا زمانہ کہیں۔ یورپ کی جدید تاریخ کو لیجئے کہ یہ تو روشنی کا زمانہ ہے۔ کیا اس تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں نہیں ملتیں کہ باغی سیکڑوں کیا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں قتل کئے گئے ہوں۔ پھر یہ کیا انصاف ہے کہ اپنے لئے تو معیار نقد دوسرا ہو اور ہمارے لئے دوسرا۔ دراصل بنو قینقاع اور بنو نضیر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ انصاف نہیں تھا بلکہ اس میں رحم کی کار فرمائی نظر آتی ہے اس لئے کہ رسول خدا جیسا رحیم انسان اسکا ذمہ دار ہے، ہاں بنو قریظہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا اور سختی

گئی۔ وہ نہایت خندہ پیشانی اور خوشدلی سے جان دینے گئی۔ عائشہؓ جن کے پاس وہ اس وقت تھی جب اسکا نام پکارا گیا اُسے ہمیشہ یاد کیا کرتی تھیں۔ رسول نے خوبصورت ریحانہ کو اپنے واسطے پسند کیا اور اُسے مسلمان

کے ساتھ وہ سزا دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر کسی کو اسمیں بیجا شدت نظر آتی ہے تو اس کے ذمہ دار رسول نہیں، سعد بن معاذؓ ہیں جو بنو قریظہ کے دوست تھے اور جنہیں خود انہوں نے نامزد کیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ سعدؓ کا بھی اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہی اس زمانے کا جنگی قانون تھا اور یہی قانون باوجود امتداد زمانہ کے ابتک ہر قوم اور ہر ملک میں جاری ہے۔ لین پول لکھتا ہے "سزا سخت تھی۔۔۔۔ لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان لوگوں کا جرم حکومت سے کھلی ہوئی بغاوت تھی اور وہ بھی محاصرے کے زمانے میں جو لوگ یہ پڑھ چکے ہیں کہ ولنگٹن کی فوج کے راستہ کا پتہ غداروں اور ڈاکوؤں کی ان لاشوں سے چلتا تھا جو ادہر اُدہر درختوں پر لٹکتی ہوتی تھیں انہیں تو کم از کم ایک غدار قبیلہ کے قتل کئے جانے پر متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے"۔ مقتولوں کی تعداد میں بھی بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مستشرقین عام طور پر سات سو کہتے ہیں لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ سب مردوں کے قتل کا فیصلہ نہیں ہوا تھا بلکہ محض اُن لوگوں کے قتل کا جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھے۔ بنو قریظہ سے جو اسلحہ جنگ مسلمانوں کو ملے تھے وہ تین سو زرہیں تھیں یہ سب تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ہتھیار ہمیشہ لڑنے والوں کی تعداد سے زیادہ رکھا جاتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ انکی تعداد بہر حال تین سو سے کم تھی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ تمام مورخین بالاتفاق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سب وہ مرد جو قتل کئے جانیوالے تھے ایک مکان میں رات کو رکھے گئے تھے جو لوگ اس زمانے کے مکانوں کی وسعت سے واقف ہیں وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ تعداد مشکل سے دو سو تک پہنچ سکتی ہے۔ مدینہ کے بڑے سے بڑے گھر میں اس سے زیادہ آدمی کسی طرح سما ہی نہیں سکتے تھے اور اسامہ بن زید کا گھر تو بڑے گھروں میں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا یہ ہے اصل حقیقت اس امر کی جو رسول اللہ کی فرد قرار داد جرم میں مستشرقین کے نزدیک سنگین ترین جرائم میں سے شمار ہوتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۷۶ تا ۸۲، تحقیق الجہاد صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۷، سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۳۹۸ تا ۴۰۳)

کرنے کے بعد اس سے خود عقد کر لیا۔[۵۱]

جنگ خندق مدینہ پر قریش کا آخری حملہ تھا۔ اب محمد (صلعم) نے مکہ کی طرف جارحانہ پیشقدمی شروع کی اس کی ابتدا انہوں نے نہایت دانائی کے ساتھ کی۔[۵۲] انہوں نے موسم حج کے امن سے فائدہ

---

۵۱ ریحانہ کو مسلمان کر کے حرم بنا لینے کا واقعہ بالکل غلط اور محض ایک افسانہ ہے۔ قیدیوں کی تقسیم میں ریحانہ رسول اللہ کے حصے میں آئی لیکن محقق یہی ہے کہ رسول اللہ نے اُسے آزاد کر دیا اور وہ اپنے بعض اعزا کے پاس چلی گئی۔ حافظ ابن مندہ نے طبقات الصحابہ میں لکھا ہے "واستری ریحانہ من بنی قریظہ ثم اعتقہا فلحقت باھلھا واحتجبت وہی عند اھلھا" اس کے علاوہ اگر رسول ریحانہ کو ازواج میں داخل کرتے تو اسکے بعد پھر کہیں تو کسی سلسلہ میں اسکا ذکر آتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ریحانہ کا کوئی ذکر بجز اس موقع کے اور کہیں نہیں آتا۔ حالانکہ رسول اللہ کی تمام ازواج کے مفصل حالات ہر جگہ ملتے ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۵ تحقیق الجہاد صفحہ ۲۳۲، اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۸۲)

۵۲ اس فقرے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلعم قریش کو دھوکا دیکر اور حج کا بہانہ کر کے مکہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ مستشرقین بلا کسی ثبوت کے رسول کی نیت پر حملہ کرنے میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ اگر رسول کا یہ مقصد ہوتا تو وہ پوشیدہ طور پر ساتھ کچھ اسلحہ تو رکھ لیتے لیکن تمام راوی اس پر متفق ہیں کہ بجز ایک ایک تلوار کے جسے عرب ہر سفر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور کوئی ہتھیار کسی کے پاس نہ تھا۔ عرب کو کعبہ کے ساتھ جو گہرا تعلق خاطر رسول اللہ کے پہلے سے تھا اسکا اندازہ جن لوگوں کو ہے انہیں رسول کے بغیر ساز و سامان کے مکہ کا سفر کر دینے پر ہرگز تعجب نہ ہوگا۔ اس سرزمین سے جہاں ہر عرب سال میں ایک بار ضرور جاتا تھا چھ برس تک باہر رہنا مہاجرین اور انصار دونوں کے لئے بہت شاق تھا۔ عرب کا عام دستور تھا کہ شدید سے شدید دشمنی رکھنے والے بھی ایام حج میں ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے اور کوئی فساد نہیں ہوتا تھا۔ انہیں وجوہ سے جب رسول کو مدینہ میں ذرا آرام نصیب ہوا تو انہوں نے زیارت کعبہ کا قصد کیا۔ اگر نیت کچھ اور ہوتی تو تھوڑی بہت خفیہ تیاری تو ضرور کی گئی ہوتی۔ لیکن اسکا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔

اٹھا کر اپنے آبائی شہر کی زیارت کا قصد کیا۔ باوجودیکہ آس پاس کے بدوی قبائل کے ملانے میں انہیں ناکامی ہوئی تاہم ایک معتدبہ جماعت (۱۵۰۰ آدمی) کے ساتھ وہ ذوالقعدہ ۶ھ (مارچ ۶۲۸ء) میں مکہ کیطرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ کعبہ کی کنجی انکے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اس خواب کی بنیاد پر انکے ساتھیوں کو کامل یقین تھا کہ اس مہم میں کامیابی ہوگی۔ لیکن قریش نے یہ طے کرلیا تھا کہ اپنے دشمن کو حج کے حیلہ سے فائدہ نہ اٹھانے دینگے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حلیفوں کو جمع کیا اور شہر کے شمال میں ایک مورچہ اس غرض سے قائم کیا کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک سکیں۔ محمد (صلعم) کو مجبوراً ارض مقدس کی سرحد پر بمقام حدیبیہ قیام کرنا پڑا۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے انہوں نے ہزار چاہا کہ طواف کعبہ کی اجازت حاصل کریں مگر ناکام رہے۔ وہ اپنے میں اتنی طاقت نہ دیکھتے تھے کہ بجبر مکہ میں داخل ہوسکیں اس لئے انہوں نے صلح جوئی کو ترجیح دی۔ نمائندے ایک طرف سے دوسری طرف آ جا رہے تھے کہ یک بیک مسلمانوں کی جماعت میں ہلچل مچ گئی۔ انہیں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اہل مکہ دغا کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب مشہور بیعۃ الشجرۃ عمل میں آئی۔ محمد (صلعم) نے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر یہ عہد لیا کہ وہ لوگ انکا ساتھ دینگے اور انکے لئے موت سے منہ نہ موڑیں گے۔ قریش کے بعض نمائندوں نے یہ تماشا دیکھا اور اس سے بیحد متاثر ہوئے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ ایسی پرجوش اطاعت جیسی محمدؐ کی انکے پیرو کرتے ہیں یا ایسا اقتدار جیسا محمد (صلعم) کو لوگوں کے دلوں پر حاصل ہے کسی طرح ممکن بھی ہے۔ وہاں سے واپس آکر ان لوگوں نے اپنے ساتھیوں کو بہت اصرار کے ساتھ یہ صلاح دی کہ بات کو بگڑنے نہ دیں۔ ایسی حالت میں قریش نے یہی مناسب سمجھا کہ محمد (صلعم) سے صلح کرلیں۔ شرائط یہ تھے کہ اس سال وہ واپس چلے جائیں تاکہ عرب یہ نہ کہہ سکیں کہ انہوں نے بزور بازو داخلہ حاصل کیا ہے اور اس کے بدلے میں آئندہ سال انہیں قربانی کی غرض سے تین دن تک ارض مقدس میں قیام کرنے کی اجازت دیجائے گی۔ تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد محمد (صلعم) نے یہ شرائط منظور کر لئے۔ اگرچہ بعض جوشیلے مسلمانوں کے خیال میں اس معاہدے پر راضی ہونا مذہبی معاملات میں کمزوری کا ثبوت دینا تھا اس لئے کہ اس کے

معنی یہ تھی کہ کعبہ کے سامنے پہنچکر وہ بغیر طواف کئے ہوئے لوٹ جائیں۔ جب معاہدے کی کتابت شروع ہوئی تو محمد (صلعم) نے ابتدا میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھوانا چاہا لیکن مکی سفیر سہیل بن عمرو نے کہا کہ وہ نہیں جانتا کہ رحمٰن کون ہے، اور اسپر اصرار کیا کہ قدیم رواج کے مطابق "باسمک اللہم" لکھا جائے مسلمانوں نے اظہار ناپسندیدگی کیا لیکن محمد (صلعم) نے اس شرط کو مان لیا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ لکھوانا چاہا:۔ "یہ معاہدہ صلح ہے مابین رسول اللہ" ۔ ۔ ۔ ۔ سہیل نے پھر اعتراض کیا اس لئے کہ اُنہیں رسول خدا تسلیم کرنیکے معنی یہ تھے کہ اپنے آپ کو اُنکا پیرو مان لیا جائے اور کہا کہ بجائے اس کے محمد بن عبداللہ ہونا چاہیے مسلمانوں نے اس دفعہ پہلے سے زیادہ شور مچایا اور اس تبدیلی پر راضی ہونے سے انکار کر دیا۔ مدینے کے دونوں قبائل کے سردار یعنی اُسید بن حضیر اور سعد بن عبادہ نے کاتب کا ہاتھ پکڑ لیا اور پکار کر یہ کہا کہ یا تو محمد رسول اللہ لکھا جائیگا یا تلوار فیصلہ کرے گی۔ مکی نمائندوں نے اس اظہار عقیدت پر متعجب ہو کر آپس میں سرگوشی شروع کی لیکن محمدؐ نے جوش میں آجانے والوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس شرط کو بھی مان لیا۔ (سورہ ۱۰-۱۱)۔

اس کے بعد عہدنامے کے الفاظ یوں قرار پائے :۔

باسمک اللہم۔ یہ عہد نامۂ صلح محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے کیا ہے۔ وہ اس پر آمادہ ہیں کہ ان کی تلواریں دس برس تک نیام میں رہیں گی۔ اس عرصے میں دونوں فریق محفوظ رہیں گے۔ ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائیگا۔ خفیہ طور پر بھی کوئی نقصان نہ کیا جائے گا بلکہ ہم ایک دوسرے سے شرافت اور ایمانداری کا برتاؤ کرینگے۔ جو محمد (صلعم) سے صلح یا معاہدہ کرنا چاہے کر سکتا ہے اور جو قریش سے صلح یا معاہدہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اگر ایک قریشی بغیر اپنے ولی کی اجازت کے محمدؐ کے پاس چلا جائیگا تو وہ فوراً واپس کر دیا جائے گا۔ لیکن بخلاف اس کے اگر محمد (صلعم) کے آدمیوں میں سے کوئی قریش کے پاس چلا جائیگا تو وہ واپس نہیں کیا جائیگا۔ اس سال محمدؐ اپنے ساتھیوں کو لیکر ہمارے یہاں سے چلے جائیں گے لیکن آئندہ سال وہ ہمارے یہاں آسکتے ہیں اور ان کو تین دن ٹھیرنے کی اجازت ہوگی لیکن مسافروں کے معمولی ہتھیاروں کے علاوہ اور کوئی ہتھیار ساتھ

نہ ہوگا اور تلواریں نیام کے اندر ہونگی۔"

اس صلح کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ایکطرف خزاعہ نے محمد (صلعم) کے ساتھ معاہدہ کرلیا اور دوسری طرف بکر بن کنانہ قریش سے مل گئے۔

اس مہم میں بظاہر جو ناکامی ہوئی تھی اس کی تلافی کے لئے محمد (صلعم) نے واپسی کے بعد فورًا خیبر (جو مدینہ کے شمال میں واقع ہے) کے مالدار یہودیوں پر حملہ کر دیا۔ بنو نضیر یہیں جاکر آباد ہوگئے تھے اور یہاں سے برابر رسول کی مخالفت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اب تک محمد (صلعم) نے یہود کے بعض ان سربرآوردہ آدمیوں کو جو انکے خیال میں سب سے زیادہ خطرناک تھے (مثلاً ابو رافع اور یسیر بن رازم)[۵۱]

---

۵۱ ابو رافع اور یسیر بن رازم کے قتل کا ثبوت ملتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے قاتل مسلمان تھے لیکن اس کا کافی ثبوت نہیں موجود ہے کہ انکو خفیہ طور پر قتل کرنے کا حکم رسول اللہ صلعم نے دیا تھا۔ ابو رافع سلام بن ابی الحقیق سرداران بنی نضیر میں سے تھا، جنگ خندق میں مکیم اسی کے ابھارنے سے شریک ہوئے تھے۔ بنو نضیر یہ وعدہ کرکے گئے تھے کہ مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے لیکن خیبر پہنچتے ہی انہوں نے رسول اور انکے ساتھیوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی اور ابو رافع ان میں سب سے زیادہ پیش پیش تھا، یسیر بن رازم بھی بنی نضیر میں تھا اور اسے بھی مسلمانوں کی مخالفت کا خاص شوق تھا۔ بنی غطفان کے ساتھ ملکر مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ یہ جرم اس قسم کے تھے کہ ان سے ہر مسلمان واقف تھا اور قوم و مذہب کے ان دشمنوں کو اگر کسی مسلمان نے قتل کر دیا تو کیا تصور کیا۔ یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قتل خفیہ طور پر عمل میں آئے تھے بلکہ جو شخص قتل کرنے گیا تھا اس نے مقابلہ کیا اور کامیاب رہا اگر قاتل کامیاب نہ ہوتے تو وہ خود مقتول ہوتے، یہ کھلی ہوئی لڑائی تھی جس میں دونوں کو برابر مواقع حاصل تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ عرب کا عام دستور تھا کہ دشمن کو خواہ اس سے ذاتی پرخاش ہو یا قبیلے کا دشمن ہو۔ جہاں کہیں پاتے تھے اس سے مقابلہ کرتے تھے اور یا تو اُسے قتل کر دیتے تھے یا خود قتل ہو جاتے تھے چنانچہ ان مسلمانوں نے بھی جنہوں نے بعض مشہور یہودیوں کو قتل کیا

چپکے سے قتل کرانے پر ہی اکتفا کی تھی، لیکن اب انہوں نے وسیع پیمانہ پر کارروائی شروع کی۔ محرم ۷ھ (مئی ۶۲۸ء) میں ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ وہ خیبر کے سامنے جا پہنچے۔ حکم تو یہ تھا کہ اس لوٹ[1] میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو حدیبیہ کی مہم میں موجود تھے مگر انکے علاوہ

اس رواج پر عمل کیا تھا، اگر وہ خود اس کوشش میں قتل ہو جاتے تو غالباً کسی مستشرق کو ان سے کوئی ہمدردی نہ ہوتی لیکن چونکہ مسلمان ہی اکثر کامیاب رہے اس لئے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ ان یہود کو چپکے سے قتل کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ یہود اسلام کی مخالفت میں سب سے آگے آگے تھے اور رسول اللہ مسلمانوں کے سردار تھے اس لئے یہ بھی سمجھ لیا گیا کہ انہیں نے انکو خفیہ طور پر قتل کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ یہ قیاس کہانتک صحیح ہو سکتا ہے اہل علم خود فیصلہ کریں۔ کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ کسی مسلمان نے اپنی ذاتی دشمنی کی وجہ سے کسی یہودی کو قتل کر دیا ہے لیکن چونکہ قاتل مسلمان تھا اور مقتول یہودی اس لئے اسکا الزام بھی رسول ہی پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس منطق کا کسی کے پاس کیا جواب ہے؟

[1] مضمون نگار خود تسلیم کرتا ہے کہ بنونضیر خیبر میں جاکر آباد ہوئے تھے اور یہاں سے برابر رسول کی مخالفت کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن جب رسول اللہ خیبر پر حملہ کرتے ہیں تو اُسے لوٹ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس اندھیر کا کوئی ٹھکانا ہے کہ بنونضیر اور اہل خیبر کو تو رسول اور مسلمانوں کی مخالفت کا حق تھا لیکن رسول اللہ کو اس کا حق نہیں تھا کہ انکی مخالفت اور دائمی خطرے سے نجات حاصل کرنیکے لئے کوئی کارروائی کریں خود اسی مضمون نگار نے پہلے لکھا ہے کہ جنگ خندق کے بانی بنونضیر تھے اور انہیں کے زور باندھنے کی وجہ سے عربی قبائل بھی حملہ آور ہوئے تھے۔ اس کے بعد بھی یہ لوگ غطفان سے ملکر مدینہ پر حملہ کرنیکا ارادہ رکھتے تھے اور کافی جماعت اکٹھا کر چکے تھے پھر ایسی حالت میں اگر رسول نے خیبر کیطرف پیش قدمی کی تو کیا قصور کیا اور کس قانون اخلاق کے مطابق انہیں مورد الزام ٹھیرایا جاتا ہے۔ خیبر یہود کا بہت بڑا مرکز تھا اور یہیں سے تمام وہ سازشیں شروع ہوتی تھیں جو اگر کامیاب ہو جاتیں تو اسلام کا نام صفحہ ہستی سے مٹ گیا ہوتا۔ اپنی حیات قائم رکھنے کے لئے اور حق کی تبلیغ میں جو رکاوٹیں پیش آتی تھیں اُن سے راستہ صاف

اور بہت سے آدمی بھی ساتھ ہو لئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہود محمد (صلعم) کے مخالفانہ ارادوں سے واقف تھے لیکن ایک دن صبح کو یہ دیکھکر کہ اُنکے قلعوں کے سامنے یہ مع اپنی فوج کے خیمہ زن ہیں وہ بالکل گھبرا سے گئے۔ یہود کے ایک سردار نے انہیں یہ بہت اچھی صلاح دی تھی کہ ایک ایک قبیلہ الگ الگ قلعبند نہ ہو جائے بلکہ مناسب یہ ہے کہ سب ملکر ایک کھلے میدان میں مشترکہ محاذ قائم کریں ورنہ اغلب ہے کہ انکا بھی وہی حشر ہوگا جو مدینے کے یہود کا ہوا لیکن انہوں نے اس رائے کو یہ کہکر ٹھکرا دیا کہ ہمارے قلعے دوسری قسم کے ہیں اور ایسی پہاڑیوں پر واقع ہیں کہ یہاں تک پہنچنا کھیل نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے قلعوں کے دروازے بند کر لئے۔ ان میں نہ تو نظم تھا اور نہ انضباط نہ ہمت تھی اور نہ عقیدت۔ ایک طرف اگر اُنکے خیالات اور جذبات میں اختلاف تھا تو دوسری طرف اُن میں سرداروں کی سخت کمی تھی۔ اُن کا سب سے بڑا آدمی سلام بن مشکم صاحب فراش ہو رہا تھا اور کنانہ ابن ابی الحقیق سے اس کی کمی کسی طرح پوری نہ ہو سکتی تھی۔ جب انہیں یکایک یہ خبر ملی کہ انکے عرب حلیف غطفان نے انکا ساتھ چھوڑ دیا تو رہی سہی ہمت بھی چھوٹ گئی جب انکے ایک قلعے کا محاصرہ کیا جاتا تھا تو وہ اس کا بھی انتظار نہ کرتے تھے کہ قلعہ سر ہو بلکہ دو ایک حملے کے بعد خود ہی اُسے خالی کر کے دوسرے قلعے میں چلے جاتے تھے جہاں پھر یہی قصہ دُہرایا جاتا تھا۔ غرض اسی طرح ایک کے بعد دوسرا قلعہ مسلمانوں کے ہاتھ آتا گیا اور غداری کی جس سے کچھ نہ کچھ کام لیا گیا تھا۔ ضرورت بالکل نہ رہی النطاۃ سے بھاگ کر یہود نے الشق میں پناہ لی پھر اُسے بھی چھوڑنا پڑا یہانتک کہ ہوتے ہوتے ان کے پاس بجز الکتیبہ (مع الوتیح وسلالم) کے اور کچھ نہ رہا۔ یہاں وہ ڈر کے مارے قلعہ کا دروازہ بند کئے

کرنے کے لئے رسول کا یہ فرض تھا کہ اہل خیبر سے یا تو صلح کریں یا انہیں امن سے رہنے پر مجبور کریں۔ اسی غرض سے رسول فوج لیکر خیبر کو گئے۔ یہود نے صلح سے انکار کر دیا تو بجز جنگ کے اور کیا چارہ تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن ہشام جلد سوم صفحہ ۱۶۹ تا ۱۹۴۔ سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۳۶ تا ۴۶۲، تحقیق الجہاد صفحہ ۸۸، اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۹۲ و ۹۳)

چپ چاپ بیٹھے رہے اور اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ پہلے کیطرح باہر نکل کر دو ایک بار معمولی حملے تو کرتے چند دنوں کے بعد وہ امان کے طالب ہوئے جو انہیں اس شرط پر ملی کہ انکی جان انکے بیوی بچے اور ایک ایک جوڑہ کپڑا تو ان کی ملکیت ہو اور باقی جو کچھ مال و اسباب ہو سب مسلمانوں کا[51]۔ اگر کسی نے کوئی چیز چھپائی تو اس کی سزا موت ہو گی۔ کنانہ بن ابی الحقیق کو بہت بے رحمی سے عذاب دیا گیا اور بعد میں قتل کر دیا گیا محض اس لئے کہ اُس نے اپنے خاندان کے مشہور جواہرات کو زمین میں دفن کر دیا تھا اور انکا پتہ نہیں بتاتا تھا[52]۔ اس طرح بیک وقت اس کی حسین بیوی صفیہ بنت حیی بھی محمد (صلعم)

---

[51] یہ صریح بہتان ہے۔ رسول اللہ نے انکا مال اسباب اور زمین انہیں بخشدی۔ ہاں جن قلعوں کو مسلمانوں نے باقاعدہ فتح کیا تھا اور جنہیں چھوڑ کر یہود پیچھے ہٹ گئے تھے (جیسا مضمون نگار خود تسلیم کرتا ہے) ان میں جو چیزیں دستیاب ہوئیں وہ ضرور مسلمانوں کے قبضے میں آئیں اور یہ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔ یہود کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد کوئی چیز بھی ان سے نہیں لی گئی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۴۹ تا ۴۵۸ اور اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۹۳)

[52] کنانہ بن ابی الحقیق جنگ خیبر کے بعد قتل تو ضرور کیا گیا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس نے خزانہ چھپا رکھا تھا۔ بلکہ سبب یہ تھا کہ اس نے ایک مسلمان کو دھوکے سے قتل کر ڈالا تھا چنانچہ قصاص میں وہ بھی قتل کیا گیا

طبری میں تصریح موجود ہے "ثم دفعہ رسول اللہ الی محمد بن مسلمہ فضرب عنقہ باخیہ محمود بن مسلمہ (صفحہ ۱۵۸۲) اس کھلی ہوئی شہادت کے بعد قیاس سے کام لینا کہانتک جائز ہے۔ خزانہ چھپانے کیوجہ سے کسی شخص کے قتل کا حکم دنیا رسول کے اخلاق سے بعید ہے جس کا ثبوت انکے ہر عمل میں مل سکتا ہے (اگر تعصب کی عینک سے نہ دیکھا جائے) یہ روایت سیرت کی عام کتابوں میں موجود ہے لیکن اصحاب فہم نے اس کی تردید کی ہے اور واضح دلائل بھی پیش کئے ہیں لیکن مضمون نگار کو تو اعتراض کے لئے کوئی بات تلاش کرنی تھی پھر وہ ان تردیدوں کو کیوں دیکھتا۔ محقق کے لئے یہ ضروری ہے کہ اعتراض کرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لے کہ یہ روایت کس درجے کی ہے لیکن ہمارے مضمون نگار کو اس سے کوئی بحث نہیں

کو مفت میں مل گئی۔ [۵]

اس مبارک و مسعود معرکے کا آخری کارنامہ "بادشاہ کی بیٹی" سے محمد (صلعم) کا عقد تھا صفیہ کو ایسے شخص سے ذرا بھی کراہیت نہ ہوئی جو اُس کے باپ حیی اور اُس کے شوہر کنانہ کے قتل کا باعث تھا بلکہ نہایت شان سے اُس نے اپنے آپ کو نئے رنگ میں رنگ لیا۔ اس سے زیادہ قابل ستائش تو ایک دوسری یہودیہ زینب کا طرز عمل تھا جس نے اپنی قوم کے قاتل کو زہر دینے کی کوشش کی اور

بلکہ زیادہ میلان ضعیف روایتوں کے قبول کرنیکی طرف ہی نظر آتا ہے۔ انصاف اور غیر جانبداری کے دعوے کے ساتھ یہ طرز عمل سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی صرف دو سبب ہو سکتے ہیں۔ فن تاریخ سے جہالت یا تعصب شدید (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۴۹ تا ۴۵۰، اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۹۳ اور تحقیق الجہاد صفحہ ۱۱۳)

[۵] مضمون نگار خود تسلیم کرتا ہے کہ یہود خیبر کی عورتیں اور بچے انہیں کے پاس چھوڑ دئے گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ صفیہ سے اگر رسول اللہ نے عقد کیا تو یہ جبراً نہ تھا بلکہ خود صفیہ نے بھی اسے برضا و رغبت منظور کیا ہوگا۔ واقدی نے رسول اللہ کی گفتگو صفیہ سے بیان کی ہے اسکے ایک فقرہ کا ترجمہ یہ ہے "میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ چاہے تو اسلام قبول کر یا یہودی رہ" (مغازی الرسول مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۹۳) عرب میں یہ عام دستور تھا کہ کسی قبیلے سے دوستی اور اچھے تعلقات پیدا کرنے کیلئے مصاہرت کو بہترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ رسول اللہ کی اکثر شادیاں اسی اصول کے ماتحت تھیں۔ جویریہ جو بنی مصطلق میں سے تھیں، جب رسول اللہ نے عقد کیا تو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی مصطلق کی تمام املاک مسلمانوں نے واپس کر دی صفیہ کا باپ حیی بن اخطب اور انکا شوہر کنانہ بن ابی الحقیق دونوں اس دنیا سے گذر چکے تھے۔ انکی تسکین اور تسلی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں تھی کہ رسول اللہ خود ان سے عقد کریں صفیہ نے بھی اسے پسند کیا اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے سے اسے اچھا سمجھا کہ رسول اللہ کیساتھ آرام سے رہیں۔ اس عقد سے رسول اللہ یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ دشمن کے ہلاک ہو جانیکے بعد اسکے پسماندہ اعزا اور ورثا سے کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہئے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۴۹ تا ۴۵۲ اور تحقیق الجہاد حاشیہ صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۹

اس جرم کی پاداش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔[1] یہ کوشش ناکام رہی لیکن کہا جاتا ہے کہ محمد (صلعم) اپنی آخری علالت میں بھی اس زہر کا اثر محسوس کرتے تھے۔

خیبر کے ساتھ ساتھ فدک بھی انکے قبضہ میں آگیا اور چند دنوں کے بعد وادی القرائے بھی جہاں یہود کی آبادی تھی۔ مال غنیمت کی مقدار بہت کافی تھی۔ جو حصہ اسکا منتقل ہو سکتا تھا وہ ایک جگہ ڈھیر کیا گیا اور اس کے بعد نیلام کر دیا گیا۔ اس سے جو آمدنی ہوئی وہ آپس میں تقسیم کر لی گئی محمد (صلعم) نے بہت شدت سے یہ پابندی عائد کی تھی کہ کوئی شخص اپنے لئے نہ لوٹے۔ زمین کھجور کے درخت اور باغات عارضی طور پر یہود کے پاس لگان پر رہنے دئے گئے اور یہ طے ہوا کہ نصف پیداوار انکے مالکوں کو دیجائے گی۔ مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ خدا کا حق تھا یعنی بالفاظ دیگر رسول کا۔ جائداد منقولہ کا خمس اور غیر منقولہ کا اس سے بھی زیادہ۔ اب ان کے پاس ایسے معتدبہ مادی وسائل تھے جن سے فائدہ اٹھانا یہ خوب جانتے تھے۔ ان سے نہ صرف اپنے خاندان کو مالا مال کرنے میں وہ مدد لے سکتے تھے بلکہ ایسے اشخاص کے ہموار کرنے میں بھی جنکو اصول سے زیادہ دولت پسند تھی۔[2]

---

[1] مضمون نگار کی ذہنیت کا اندازہ اس سے اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ زینب یہودیہ کے اس فعل کو کہ اس نے رسول کو اپنے گھر دعوت میں بلا کر زہر دیدیا ایک قابل ستائش عمل سمجھتا ہے۔ لیکن دوسری طرف خود رسول کی رحمت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے باوجود اس جرم عظیم کے اس عورت سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اسے معاف کر دیا۔ زینب کے قتل کی روایت غلط ہے (ملاحظہ ہو طبری جلد سوم صفحہ ۱۰۴، ابن الاثیر جلد دوم صفحہ ۱۷۰)

[2] کیا مضمون نگار کے پاس اسکا کوئی ثبوت ہے کہ رسول نے مال غنیمت اپنی ذات کو یا اپنے خاندان کو ناجائز طور پر فائدہ پہنچایا ہو جنگ میں ہمیشہ جو کچھ ملتا تھا اس کا خمس عام اجتماعی کاموں کے لئے رکھ لیا جاتا تھا۔ یہی خدا یا رسول کا حصہ تھا اسکے بعد تمام مال عام مسلمانوں میں برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ خود رسول کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے کبھی مال و زر اپنے اوپر خرچ نہیں کیا۔ انکے حصہ میں جو کچھ آتا تھا وہ بھی

صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے ساتھ محمد (صلعم) کی مدنی زندگی کا پہلا دور ختم ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان واقعات سے محض اتنا ہی ہوا کہ عملاً انکی جو حیثیت جنگ خندق کے بعد قائم ہو چکی تھی وہ اور زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اگرچہ ابتدا میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ محمد (صلعم) نے نہایت شرمناک طور پر ہزیمت اٹھائی لیکن بعد کو یہ پتہ چلا کہ درحصل فائدہ اس میں انہیں کا تھا۔ ابوبکرؓ اکثر کہا کرتے تھے کہ "اسلام کی کوئی فتح اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی صلح حدیبیہ کو حاصل ہے۔ لوگ ہمیشہ بات کو جلد ختم کرنا چاہتے ہیں مگر اللہ کو پختگی پسند ہے"۔ اس سے پہلے مسلمانوں اور باقی عرب کے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ وہ ایک دوسرے سے کبھی باتیں نہ کرتے تھے جب کبھی ملتے تھے تو فوراً لڑنے لگتے تھے لیکن اس کے بعد مخالفت کم ہوتی گئی۔ احساس امن اور باہمی اعتماد نے اُس کی جگہ لی اور ہر شخص جو اوسط درجے کی عقل رکھتا تھا اسلام کا نام سنتے ہی اس میں داخل ہونے لگا۔ بائیس ماہ کے عرصے میں جو امن کا زمانہ تھا۔ اسلام لانیوالوں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی اور یہ دین عرب کے گوشے گوشے میں پھیلنے لگا۔

مذہب کی حیثیت سے اسلام میں عربوں کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ انکی طبیعت نماز۔ تلاوت قرآن اور زکوٰۃ کیطرف کسی طرح مائل نہ ہوتی تھی۔ اسکا کافی ثبوت اُن جنگوں میں موجود ہے جو آئے دن انکے اور محمدؐ کے درمیان ہوتی رہتی تھیں۔ ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ محمدؐ کی طرف سے جو داعی ان لوگوں کو دین کی تعلیم دینے کے لئے بھیجے گئے تھے ان میں سے بہتوں کو انہوں نے قتل کر ڈالا۔ ہم

سائلوں کو دیدیا کرتے تھے۔ سیرۃ کی تمام کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ دوسروں کو بھی انکے حق سے زیادہ کبھی نہیں دیتے تھے خواہ وہ اپنا ہو یا غیر ہو۔ ایسی بین شہادتوں کے ہوتے ہوئے یہ الزام لگانا کہ وہ اپنے خاندان کو مالا مال کرتے تھے یا لوگوں کو روپیوں کا لالچ دیکر اپنا ہم خیال بناتے تھے۔ صریح بہتان نہیں تو اور کیا ہے؟۔ اگر (نعوذ باللہ) رسول اس قسم کے انسان ہوتے تو ان کے پاس کے رہنے والے بھلا کس طرح انکے گرویدہ اور فرمانبردار ہو سکتے تھے۔

بمشکل یہ باور کر سکتے ہیں کہ یک بیک ان میں کوئی نئی روح جاری وساری ہوگئی ہو انکے رویہ کی تبدیلی کیوجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا رعب ان پر طاری ہو رہا تھا اُنکے دلوں میں مسلمانوں کی وقعت پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ مسلمان جو باوجود قلت تعداد کے تمام عالم کے مقابلے کے لئے تیار رہتے تھے محض اس لئے کہ وہ متحد الخیال تھے اور انہیں اس کی مطلق پرواہ تھی کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ عربوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مکہ اور مدینہ کی عظیم الشان جنگ میں جس میں بحیثیت شریک یا تماشائی کم و بیش ہر ایک نے حصہ لیا تھا، فتح کا پلہ آہستہ آہستہ مدینہ کیطرف جھکتا جاتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ عقیدت کے مقابلہ میں طاقت کا کچھ بس نہیں چل سکتا جنگ خندق سے مکہ کے اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور صلح حدیبیہ سے اس کو بالکل تقویت نہ حاصل ہوئی اس لئے کہ اگر ایک طرف قریش نے محمدؐ کو ہاتھ کے اشارے سے واپس کر دیا تو دوسری طرف آئندہ سال داخلے کی اجازت بھی دیدی۔ اسلام " اپنی گردن پھیلا چکا تھا "، اس نے ایک مستحکم اور ناقابل فنا ہستی قائم کر لی تھی اور اب وہ آخری فتح کے لئے لڑ رہا تھا۔ مزید برآں نئے مذہب کی موافقت میں ایک اور قوی دلیل تھی جس کے ماننے کیلئے عرب ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ یہ وہ مال غنیمت تھا جو کثیر مقدار میں مسلمانوں کو ہر جنگ کے بعد حاصل ہوتا تھا۔ اس میں شبہے کی مطلق گنجائش نہیں کہ اسلام کی مادی ترقی ہی وہ کشش تھی جس کی وجہ سے روز ایک نئی جماعت اس کی طرف مائل ہوتی رہتی تھی[1]۔

---

[1] مضمون نگار کا یہ خیال صحیح نہیں کہ عربوں کے لئے بحیثیت مذہب کے اسلام میں کوئی کشش نہ تھی بلکہ وہ تمامتر صرف حرص مال کیوجہ سے اسلام لائے تھے۔ اگر سرسری طور پر بھی جاہلیت کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل ظاہر ہو جائے گی کہ عربوں کی فطرت میں دین اور مذہب سے لگاؤ ہمیشہ سے تھا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ غیر متمدن اقوام میں عبادت کی خواہش اور مذہبی جذبہ متمدن اقوام سے بہت زیادہ ہوتا ہے پھر اہل عرب جن کے پاس نہ کھانیکو غلہ اور نہ پہننے کو کپڑا تھا جو اپنی تمام ضروریات کے لئے فطرت کی متلون مزاجی کے پابند تھے کس طرح مذہب اور عبادت سے بیگانے رہتے۔ دین اور یادِ خدا سے تو وہ قوم بے پروا ہوتی ہے

جس کا پیٹ بھرا ہوا اور جسکو تمام ضروریات کی چیزیں بے ہاتھ پیر ہلائے ملجائیں۔ یہی وجہ ہو کہ عرب ہمیشہ سے مذہب کیطرف مائل رہتے ہیں۔ یہ بالکل دوسری بات ہو کہ صحیح مذہب ان میں نہ تھا۔ توہمات کی کثرت تھی۔ مظاہر قدرت کو قادر مطلق سمجھکر پوجتے تھے لیکن ان چیزوں کا وجود ہی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہو کہ انکی طبیعت میں مذہب سے لگاؤ موجود تھا ضرورت صرف صحیح رہنمائی کی تھی اور جب انہیں یہ رہنمائی حاصل ہوئی تو پھر جوق جوق وہ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ مہاجرین جب اسلام لائے تو انہیں کون سے مالی فائدے کی امید تھی انہوں نے جو تکالیف برداشت کیں ان سے کون ناواقف ہو۔ انصار نے جب بے خانماں مہاجرین کو اپنے گھر میں جگہ دی اور دوسرے کی بلا اپنے سر لی تو انہیں کیا مادی منافع حاصل ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ کفارے اور رسول اللہ صلعم سے آئے دن جنگیں ہوا کرتی تھیں لیکن کیا مضمون نگار کو معلوم نہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ یہ وہ عرب نہیں تھے جو مذہب سے بیگانہ تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مدت سے مذہب کو ایک ڈھونگ بنا رکھا تھا اور اس کی آڑ میں اپنے ذاتی مفاد کو پورا کیا کرتے تھے۔ اسلام کا عروج فطرتاً انکا زوال تھا۔ حق کا پیدا ہونا باطل کی موت ہو۔ اہل مکہ اور یہود کا برافروختہ ہونا اور جنگ پر آمادہ ہونا اسی وجہ سے تھا۔ عام عربوں تک تو ابھی اسلام کی آواز ہی نہیں پہنچی تھی اور اگر بعض نے سنا بھی تو ان کو کفار قریش نے طرح طرح غلط خبریں سنا کر رسول اللہ سے بدظن کر دیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ کو کچھ چین نصیب ہوا تو انہوں نے مختلف اطراف میں داعی بھیجے اور عربوں کو بتایا کہ اسلام ان سے کیا چاہتا ہے۔ اب جبکہ صحیح طور پر انہیں تعلیم دی گئی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اسلام نہ لاتے۔ دو واقعے ایسے بھی ملتے ہیں کہ داعیان اسلام قتل کردئے گئے لیکن مضمون نگار کا یہ بیان کہ ایسے واقعات کثرت سے ہوئے غلط ہے۔ اکثر تو یہ ہوا کہ لوگ اسلام کی شہرت سنکر آئے اور اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو لے گئے جو انہیں اصول اسلام کی تعلیم دے سکیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک جماعت ایسی بھی تھی جو محض حرص مال وجاہ سے اسلام لائی تھی لیکن ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ قرآن خود یہ تسلیم کرتا ہے کہ بعض دنیا کے خیال سے آکر داخل ہوئے

کو پہنچا۔ یہ امن جو تقریباً دو برس تک قائم رہا قریش کے لئے نت نئے نقصان اور آئے دن کی ذلتوں کا باعث ہوا۔ تمام توقعات کے خلاف وہ شرط جو انکے فائدے کی معلوم ہوتی تھی، اور جس کے ماتحت محمد (صلعم) نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ایسے آدمیوں کو جو سن بلوغ سے قبل مکہ سے بھاگ کر انکے پاس چلے آئیں گے فوراً واپس کر دینگے، قریش کے لئے ایک آفت بنگئی اور انہیں مجبور ہو کر محمد (صلعم) سے یہ درخواست کرنی پڑی کہ اس شرط کو بدل دیں[1] اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ یہ بات ہوئی کہ مکہ کے تین بہت مشہور آدمی خالد بن الولید عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ محمد سے جا ملے جبکہ انہوں نے نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ دوسرے سال شرمندگی اور غصہ کے جذبات کو دل میں چھپائے ہوئے انہیں یہ منظر دیکھنا پڑا کہ عہد نامے کی شرط کے مطابق محمد (صلعم) دو ہزار آدمیوں کو ساتھ لیکر مکہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے تمام مناسک ادا کئے (عمرۃ القضا مارچ ۶۲۹ء) اب بھی وہ اعلان جنگ سے خائف نظر آتے تھے اور انہیں اتنی بھی جرأت نہ ہوتی تھی کہ خزاعہ سے جو انکے گھر میں محمد (صلعم) کے جاسوس

ہیں (منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرہ) مگر مضمون نگار کے پاس اسکی کیا دلیل ہے کہ سب کے سب ایسے ہی تھے۔ بیشک مستشرقین کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یک بیک عربوں میں نئی روح کیونکر جاری و ساری ہو گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ تو نہیں ہونا چاہئیے کہ وہ بے معنی قیاسات اور مہمل بدگمانیوں سے اس کی توجیہ کریں۔ اگر تعصب سے الگ ہو کر وہ غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلعم کی بے نظیر شخصیت اور انکے پیرؤں کی بے مثل وفاداری ہی اصل وجہ تھی عربوں کے جوق جوق مشرف باسلام ہونیکی تلوار ممکن ہے وقتی اطاعت حاصل کر سکے، حرص مال ممکن ہے عارضی طور پر لوگوں کو کھینچ سکے لیکن یہ اسباب ایسے نہیں ہیں جن کے نتائج دیرپا ہوں، جو لوگ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس حقیقت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں کہ مذہب کی صحیح روح ان میں موجود تھی اور اکثر عرب محض یہی تڑپ دیکھکر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

[1] واقدی صفحہ ۲۶۱ - ابن ہشام صفحہ ۷۵۰ (د)

تھے کسی طرح چھٹکارا حاصل کریں۔" وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں تو دوسرا پیچھے کھینچ لیتے ہیں انہیں پورا یقین ہے کہ فتح محمدؐ کے حصہ کی ہے۔" یہ تھا وہ نقش جو اعراب کے دلوں پر قریش کے طرز عمل سے قائم ہوگیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل میں بدویوں کی نظر ہوتی بھی بہت تیز ہے۔ انہیں اپنے آپ پر بالکل اعتماد نہ رہا تھا وہ جانتے تھے کہ ایک فیصلہ کن جنگ ابھی باقی ہے لیکن انہیں اس کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ خود اس کی ابتدا کر کے کسی نتیجہ پر پہنچائیں۔

مگر انکی مرضی کے خلاف فیصلہ کا وقت آن پہنچا۔ بنو بکر نے محمد (صلعم) کے حلیف خزاعہ پر حملہ کردیا اور بعض قریشیوں نے بھی ان کی مدد کی۔ خزاعہ نے رسول سے فریاد کی اور انہوں نے فوراً اس واقعہ کو اعلان جنگ کا ایک بہانہ بنالیا[۵]۔ اہل مکہ نے ابوسفیان کو ازسر نو صلح کرنے کی غرض سے

---

[۵] مضمون نگار کے خیال میں غالباً یہ سبب مکہ پر حملہ کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ صلح حدیبیہ میں یہ صاف صاف طے ہوگیا تھا کہ دس برس تک کوئی جنگ نہ کرے گا لیکن قریش کے حلیف بنی بکر نے مسلمانوں کے حلیف بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ باہمی معاہدے کی رو سے رسول کا فرض تھا کہ اپنے حلیف کی مدد کرتے اس کے علاوہ اگر اس دفعہ رسول خاموش بھی رہتے تو اس کی کیا ضمانت تھی کہ قریش آئندہ کوئی فعل معاہدہ کے خلاف نہیں کریں گے۔ ان کی اس خلاف ورزی سے پھر یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کبھی نہ کبھی یہ لوگ مل کر مدینہ پر حملہ کریں گے۔ مضمون نگار کا یہ خیال صحیح نہیں کہ قریش میں دم باقی نہ رہا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس صلح سے وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور در پردہ اس کی تیاری کر رہے تھے کہ یک بیک ایک آخری حملہ کر دیں۔ خزاعہ پر حملہ اس کارروائی کی ابتدا تھی اور اگر رسول اللہ صلعم کمال دانائی سے کہ کیطرف پیش قدمی کر کے ان کی تمام سازشوں پر پانی نہ پھیر دیتے تو بہت ممکن تھا کہ ایک خونریز جنگ اور ہوتی اور بہتیرے گھر ویران ہو جاتے۔ عرب میں امن اور تبلیغی آزادی حاصل کرنے کی یہی ایک صورت تھی کہ مکہ پر جو تمام فتنوں کا مرکز بنا ہوا تھا قبضہ کرلیا جائے۔

مدینہ روانہ کیا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ رسول کو انکے ارادے سے باز رکھنا ناممکن تھا۔ رمضان ۸ھ (جنوری سنہ ۶۳۰ء) میں دس ہزار کی جمعیت کیساتھ وہ مکہ کی سمت روانہ ہو گئے۔ انصار اور مہاجرین کے علاوہ اسلم، غفار، مزینہ جھنیہ اور اشجع بھی ساتھ تھے۔ سلیم اور خزاعہ راستہ میں آملے۔ بدوی مال غنیمت کی امید میں ہر طرف سے پہنچ آئے تھے۔ عیینہ فزاری کو اسکا بہت قلق تھا کہ وہ بنی غطفان کو اپنے ساتھ نہ لاسکا اس لئے کہ یہ معلوم نہ تھا کہ جا کہاں رہے ہیں۔ محمد (صلعم) نے شروع شروع میں منزل مقصود کا پتہ کسی کو نہیں دیا تھا۔ تاہم بعض مکی امراء کو غالباً اس کی خبر تھی مثلاً مخرمہ بن نوفل اور عم رسول عباس رض نے اپنے شہر کے فتح ہونیکا انتظار نہیں کیا بلکہ دشمن ابھی دور ہی تھا کہ اس سے جاملے۔ ابوسفیان کو خصوصاً اس راز کی خبر تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں ہی ان سے یہ وعدہ کر لیا گیا تھا کہ اگر بلد حرام پر بغیر جنگ کے قبضہ ہو گیا تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائیگا اور غالباً خود انہوں نے بھی یہ عہد کیا تھا کہ وہ شہر کو چپکے سے رسول کے حوالے کرنیکی پوری کوشش کرینگے[۱]۔ لیکن عوام کے سامنے ایک ناگہانی حملے کا سوانگ کھڑا کرنا ضروری تھا تاکہ طاقت کی غیر متوقع نمائش کے سامنے ناچار

---

[۱] مستشرقین ہر اس واقعے کو جس سے رسول یا اسلام کی عظمت کا اظہار ہو حقیر کر کے دکھانے کے عادی ہیں۔ یہ کسی طرح انکی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا شہر جو مخالفین اسلام کا مرکز تھا بلا خونریزی کے کس طرح فتح ہو گیا۔ اگر اس میں کوئی خفیہ کارروائی ثابت نہ ہوئی تو یہ انکے اس دعوے کو غلط ثابت کر دے گا کہ "اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ سے ہوئی ہے"۔ چنانچہ دور از کار اور بعید از عقل قیاسات کے ذریعے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ابوسفیان پہلے سے رسول اللہ سے مل گئے تھے۔ ایسے واقعات کیا تاریخ میں نہیں ملتے کہ کسی شہر کا اچانک محاصرہ کر لیا گیا ہو اور اہل شہر نے مقابلے کو بے سود سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ پھر یہی بات یہاں کیوں قابل قبول نہیں۔ مستشرقین اگر تعصب کو چھوڑ دیں تو انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فتح مکہ رسول خدا صلعم کی عظمت و جرأت کی ناقابل تردید دلیل ہے۔

سب کی گردن جھک جائے۔ بعد کو یہی کھیل طائف میں بھی کھیلا گیا۔ سربرآوردہ آدمیوں نے ثقیف سے مشورہ کئے بغیر رسول سے صلح کر لی اور اس کے بعد ایسی ترکیبیں کیں کہ لوگوں پر ظاہر یہی ہو کہ واقعات سے مجبور ہو کر انہوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا ہے[1]۔ قبل اس کے کہ اہل مکہ کو اسکا گمان بھی ہو مسلمان ارض پاک کی حدود تک پہنچ گئے۔ ایک رات کو ناگہاں شہر کے شمال مغرب میں ہر طرف آگ ہی آگ روشن نظر آئی۔ ابو سفیان حیرت زدہ صورت بنا کر نہایت سرعت کے ساتھ مقابل کے خیموں کی طرف روانہ ہوئے اور یہ خبر لیکر لوٹے کہ "مسلمان دروازے پر پہنچ گئے ہیں۔ بغیر کسی تیاری کے اگر انکا مقابلہ کیا گیا تو انکی برتر قوت کے سامنے کچھ پیش چلنا محال ہے اب مناسب یہی ہے کہ شہر ان کے حوالے کر دیا جائے۔ محمد (صلعم) نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ اپنے گھروں کے اندر رہیں گے یا ہتھیار ڈال دینگے ان پر حملہ نہ کیا جائے گا۔" خوف زدہ شہریوں کے لئے اب بجز اس کے اور کیا چارہ تھا کہ اس صلاح پر عمل کریں۔ چنانچہ مسلمان ہر سمت سے شہر کے اندر داخل ہوئے اور ایک جگہ کے علاوہ کہیں کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی یہ مقابلہ بھی دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ محمد (صلعم) نے اپنے سپہ سالاروں کو سخت تاکید کر دی تھی کہ خونریزی مطلق نہ ہو۔ صرف دس آدمیوں کے قتل کا حکم دیا گیا اور ان میں سے بھی نصف کو بعد میں معافی مل گئی۔ انہوں نے مکہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ اس سے متعلق تمام حقوق و مراعات کی تصدیق کی اور یہ بات بالکل عیاں کر دی کہ اسلام کے زیر اثر پرانے طریقہ عبادت میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا۔ سب مراسم اسی طرح قائم رہے بس اتنا ہی ہوا کہ انہوں نے تمام بتوں کی عبادت کو خواہ وہ کعبہ سے ملحق ہوں یا لوگوں کے گھروں میں ہوں۔ منسوخ کر دیا۔ لیکن مکہ سے باہر کے تمام معابد مسمار کر دئے گئے بجز انکے جنکا تعلق ادائیگی حج سے تھا اور جو ایک طرح سے کعبہ کا جزو تھے۔ اس طرح مکہ کے طریق عبادت کو ایک جدید اہمیت حاصل ہوئی۔ محمد (صلعم) کی اصلاحات نے مکہ کے حق میں وہی کیا جو یوشع نے یروشلم کے لئے کیا

---

[1] طائف کا واقعہ تفصیل کے ساتھ آگے آتا ہے۔ وہاں اس سے بحث کیجائے گی۔

تھالیہ

کعبہ کو اسلام کے ساتھ ضم کردینے کی آخری کوشش جس سے وہ دنیائے اسلام کا دینی مرکز بنگیا۔ ایک سال بعد عمل میں آئی۔ جب سورہ نمبر ۹ کی مشہور برارۃ نے مشرکین کو حج میں حصہ لینے سے روک دیا۔ اسی دن سے یہ تہوار مخصوص اسلامی تہوار ہوگیا اور اسی روز سے مقدس مہینوں کی حرمت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ دوسرے سال (ذوالحجہ سنہ ۱۰ھ مطابق مارچ ۶۳۲ء) خود رسول نے پہلی بار صحیح اسلامی طریقہ سے حج کے فرائض ادا کئے۔ قدیم مراسم میں بعض ترمیمیں کیں اور جن رسموں میں کچھ اختلاف تھا ان کی ایک صورت قائم کردی ان کا یہ دعوٰی تھا کہ وہ دوبارہ ان تمام مراسم کو وہی شکل دے رہے ہیں جو ابراہیم کے عہد میں تھی اور ان تمام بدعات کو منسوخ کررہے ہیں جو مشرکین نے

۱؎ بتوں کی عبادت کو منسوخ کرکے ایک خدا کی پرستش کا جاری کرنا مضمون نگار کے نزدیک بہت حقیر کارنامہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے لئے "صرف" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق تھا جو اسلام اور اہل مکہ کے دین میں تھا۔ رسوم اور آداب تو ثانوی چیزیں ہیں اصل تو روح اور نیت ہے۔ کعبے کو بتوں سے پاک کرنا اور خدائے واحد کیطرف لوگوں کو مائل کرنا ہی وہ عظیم الشان مقصد تھا جس کے لئے رسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے تھے اور اس کو انہوں نے باحسن وجوہ پورا کیا۔ رسول اور انبیاء تعمیر کے لئے بھیجے جاتے ہیں تخریب کے لئے نہیں پھر ان چیزوں کو منسوخ کرنے کی کیا ضرورت تھی جو توحید کے منافی نہ تھیں۔ ان تمام آثار کو جو شرک اور بت پرستی کے موجود تھے، رسول اللہ نے مسمار کردیا اور ان کی جگہ پر شعائر اللہ کو قائم کیا۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہیے تھا؟

۲؎ مقدس مہینوں کی حرمت کا کب خاتمہ ہوا۔ اب تک عرب کے مسلمان "اشہر حرم" میں جنگ کو جائز نہیں سمجھتے۔ ہاں اگر ان مہینوں میں کوئی ان پر حملہ کرے تو اپنی حفاظت کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہی خدا اور رسول کا حکم ہے اور عقل سلیم بھی اس کی تائید کررہی ہے "یسئلونک عن الشہر الحرام قتال فیہ قل قتال فیہ کبیر وصد عن سبیل اللہ وکفر بہ والمسجد الحرام واخراج اہلہ منہ اکبر عند اللہ۔ والفتنۃ اکبر من القتل" دوسری جگہ فرمایا "ان عدۃ الشہور عند اللہ اثنا عشر شہرا فی کتاب اللہ یوم خلق السموات والارض منہا اربعۃ حرم"

رائج کر دی تھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے جنتری کی بھی از سر نو تشکیل کی۔ سال میں کبھی کبھی ایک مہینہ کے اضافہ کا جو رواج تھا اُسے ایجاد انسانی بتلا کر ناجائز قرار دیا اور چاند کی بارہ مکمل گردشوں پر ایک قمری سال کی بنیاد رکھی۔

اب ہم پھر فتح مکہ کیطرف واپس آتے ہیں۔ قریش کے گردن جھکا دینے کے بعد انکے بدوی حلیف بھی ایک ایک کر کے حلقہ اطاعت میں آ گئے۔ لیکن ان کے پڑوسی ہوازن جن میں طائف کے باشندے ثقیف بھی شامل تھے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے جمع ہوئے۔ طائف اور مکہ کے درمیان اوطاس کے مقام پر انکی فوج خیمہ زن ہوئی۔ محمد (صلعم) بھی انکی طرف بڑھے اور وادی حنین میں دونوں فوجیں ملیں۔ دشمن کے پہلے ہلے میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے رسول بھی خطرہ میں گھر گئے تھے لیکن خزرج انکے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے نہ صرف ہوازن کی پیش قدمی کو روکا بلکہ انکو شکست دیکر بھگا بھی دیا۔ فاتح فوج کے حصے میں بے انتہا مال غنیمت آیا اس لئے کہ ہوازن اپنے تمام مویشی اور اہل و عیال کو بھی ساتھ لائے تھے اور انہیں اپنے عقب میں رکھا تھا تاکہ انہیں پوری طرح اسکا احساس ہو سکے کہ وہ کس لئے لڑ رہے ہیں۔ محمد (صلعم) نے اس مال و منال کو وادی جعرانہ میں، جو حرم کی شمالی مغربی سرحد پر طائف کی وسیع وادی سے تھوڑی دور واقع ہے بھجوا دیا اور خود طائف کے محاصرے کے لئے آگے روانہ ہو گئے۔ یہاں انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ انکے سامنے ایک پیالہ دودھ سے بھرا ہوا رکھا گیا ہے جس میں ایک مرغ نے ٹھونگ مار کر سوراخ کر دیا اور تمام دودھ بہ گیا چودہ روز کے بعد انہوں نے محاصرہ اٹھا لیا اور جعرانہ کیطرف مال غنیمت کی تقسیم کے لئے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اب تک اس لئے تاخیر کی تھی کہ شاید ہوازن اپنے مویشی اور اہل و عیال کو واپس لینے کی غرض سے اسلام قبول کر لیں۔ لیکن چونکہ اب تک انہوں نے کوئی آدمی نہیں بھیجا اس لئے بدویوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر انہیں مال غنیمت کی تقسیم شروع کرنی پڑی۔ جب وقت گذر چکا تو ہوازن کے ایلچی انکے اسلام لانے کی خبر لیکر پہنچے۔ اب انہیں اپنے جانوروں کو چھوڑ کر محض اس پر قناعت کرنی پڑی کہ انکے بیوی بچے

رسول کی سفارش سے اپنے نئے مالکوں کے ہاتھ سے نکل کر انہیں واپس مل جائیں۔ بدویوں کو تو جو کچھ انہوں نے واپس کیا تھا اسکا معاوضہ مل گیا، لیکن مہاجرین و انصار نے اپنا حصہ مفت چھوڑ دیا۔ بحیثیت مجموعی اس تقسیم غنیمت میں اہل مدینہ سب سے زیادہ نقصان میں رہے حالانکہ محنت جنگ سب سے زیادہ انہیں نے اٹھائی تھی۔ نفع زیادہ اس میں مکہ کے امرا کا ہوا جنہوں نے لڑائی میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا لیکن محمد (صلعم) انہیں مال دیکر تالیف قلوب کرنی چاہتے تھے (سورۃ ۹-۶۰)

فتح مکہ کا اثر اسلام کی آئندہ ترقی پر بالکل الٹا پڑا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو فاتح تھے وہی مفتوح ہو گئے۔ مسلمانوں نے قریش پر کیا فتح پائی کہ گویا قریش ہی مسلمانوں پر حاوی ہو گئے۔ اسکا الزام اگر کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ خود رسول ہی ہیں۔ مکہ کو اسلام کا یروشلم بنانے میں بظاہر تو انکے اغراض مذہبی معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت محمد (صلعم) کے دین کو کعبہ اور حج کے ان مشرکانہ مناسک سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ابراہیم کو ان تمام مراسم کا بانی کہنا ایک مقدس فریب تھا۔ اصل میں محمد (صلعم) کا مقصد یہ تھا کہ بت پرستی کے اس عنصر کو اسلام میں داخل کر کے اُسے متعصب عربوں کے لئے قابل قبول بنا دیں اور ساتھ ہی ساتھ جذبہ وطنیت سے بھی وہ کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے انکے طرز عمل میں مقامی جذبات کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے ؎۔ قریش سے

؎ رسول اللہ کے دین کو خود ان سے زیادہ ہمارا فاضل مضمون نگار جانتا ہے۔ جب ہی تو یہ دعوے کرتا ہے کہ حج کے مشرکانہ مناسک کو محمد (صلعم) کے دین سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہم حج کے تمام مناسک پر بار بار نظر ڈالتے ہیں لیکن ہمیں تو ان میں شرک کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا چہ جائیکہ وہ سراسر مشرکانہ ہوں (معاذاللہ من ذلک) وہاں تو قدم قدم پر خدائے واحد کی راہ میں اپنی شخصیت کو گم کر دینے کے مظاہر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ اب ہم مستشرقین کی عینک کہاں سے لائیں کہ توحید میں شرک اور شرک میں توحید نظر آئے۔ اگر اس موضوع پر مضمون نگار نے تفصیلی بحث کی ہوتی تو ہم بھی جوابات سے بحث کرتے۔ ایسے اچٹتے ہوئے اعتراض پر بجز اس کے کہ عقل و خرد کا ماتم کیا جائے اور کیا ممکن ہے۔ رہا حضرت ابراہیم کے بانی کعبہ ہونے کا

متعلق انکا رویہ سرتا سر قبیلہ پرستی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان امرا کی تالیف قلوب کو اتنا اہم سمجھا خیال ہوتا ہے کہ انہیں باقی تمام دنیا کو مسلمان بنانے سے زیادہ انکی فکر تھی۔ انہوں نے قریش کے پاس وہ سب کچھ رہنے دیا جو اب تک انکا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان لوگوں نے جو کچھ طلب کیا انہوں نے بے تکلف عطا کیا محض اس لئے کہ وہ انکے دوست رہیں ابوسفیان خود ایک بڑے آدمی تھے لیکن محمدؐ نے فوراً انکا رتبہ بڑھانے کے لئے انکو ایک وسیع خطہ کا جو مکہ کے جنوب میں واقع تھا والی بنا دیا۔ انہوں نے تمام وہ تدابیر اختیار کیں جن سے قریش کے لئے تبدیل دین آسان ہو جائے اور انہیں یقین ہو جائے کہ اسمیں انکا نقصان کم ہے اور فائدہ زیادہ قریش میں اتنی عقل موجود تھی کہ وہ اس پہلو کو سمجھیں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ چنانچہ بہت جلد وہ بہترین مسلمان بن گئے اور اس سے انہیں بہترین عملی فوائد حاصل ہوئے[۵]

سوال۔ یہ مسئلہ ہمیشہ سے عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے ناقابل قبول رہا ہے۔ وہ کسی طرح اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ حضرت ابراہیم حضرت حاجرہ کے ساتھ مکے کی گھاٹیوں میں آئے تھے اور یہیں حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے تھے۔ اس بحث پر علمائے اسلام نے مستقل تصانیف چھوڑی ہیں جن لوگوں کو دلچسپی ہو اسکا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس مختصر سے رسالے میں اس کی گنجائش نہیں کہ ایسے طویل الذیل مسئلے کو چھیڑا جائے۔ اس کے لئے تو خود ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ بت پرستی کے عنصر کو اسلام میں داخل کرنے کی بھی خوب ہی کہی وہ شخص جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بت پرستی کو مٹانے میں صرف کیا ہو اور طرح طرح کی مصیبتیں اسی راہ میں جھیلی ہوں اس پر یہ الزام رکھنا کہ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت اس نے بت پرستی کو اپنے دین میں داخل کر لیا، صاحب عقل و دانش مستشرقین ہی کا کام ہے۔ ناکامی کے وقت دب کر اپنے اصول کو چھوڑنے کی مثال تو سننے میں آئی ہے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اس مقصد میں ترمیم کرنا یہ پہلی دفعہ سنا گیا ہے۔

[۵] یہ اعتراض کرتے وقت کاش مضمون نگار نے ان واقعات پر غور کیا ہوتا جنہیں وہ پہلے لکھ چکا ہے۔ و

قریش سے محمد (صلعم) کا یہ سُلوک اہل مدینہ کو سخت ناگوار گذرا اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ انہوں

انسان جس نے محض تبلیغ حق کی خاطر طرح طرح کی تکالیف برداشت کیں، گھر کو چھوڑ کر بے گھر ہوا جس نے اپنے اعزا اور اقارب سے محض اس لئے دشمنی مول لی کہ وہ سچے دین کی اشاعت کرنا چاہتا تھا جسے یہ لوگ ناپسند کرتے تھے اس پر قبیلہ پرستی کا الزام اور وہ بھی اس قبیلے کی طرفداری کا الزام جس نے اس کی ذات کے لئے دنیا کا کوئی ستم اٹھا نہ رکھا ہو۔ اگر رسول کو قبیلہ پرستی ہی کرنی تھی تو وہ مال اور دولت حضرت علی کو دیتے جو انکے داماد تھے، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دیتے جو انکے جان نثار دوست تھے اور جن کی لڑکیاں ان کے عقد میں تھیں، حضرت عثمان کو دیتے جو انہیں اس قدر عزیز تھے کہ یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح ان سے کیا یا اُن دوسرے مہاجرین کو دیتے جو شروع سے انکی مصیبتوں میں شریک تھے۔ کیا اِن حضرات سے بھی زیادہ دنیا میں کوئی رسول پر جان فدا کرنے والا اور رسول کی عنایت کا مستحق تھا۔ پھر جب کبھی ان کے حصے سے زیادہ ان لوگوں کو نہیں ملا تو یہ کیسے یقین آسکتا ہے کہ دوسروں کو انکے حق سے زیادہ رسول اللہ جیسے عادل کے ہاتھوں ملا ہوگا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلعم نے وہ تمام تدابیر اختیار کیں جن سے قریش کے لئے تبدیل دین آسان ہوجائے اور انہیں یہ یقین ہوجائے کہ اس میں انکا نقصان کم ہے اور فائدہ زیادہ ہے" اور یہی ہر مبلغ کا فرض بھی ہونا چاہئے۔ خدا کبھی بندوں کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا بلکہ وہ توان کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا چاہتا ہے اور خدا کے سچے نبی کا بھی یہی شیوہ ہونا چاہئے۔ کفار قریش کے دفعتاً اسلام لانے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اب انہیں یقین آگیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے نبی ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ باوجود اپنی تمام کوششوں کے وہ حق کی آواز کو دبا نہ سکے۔ انہوں نے حیرت اور استعجاب کے ساتھ دیکھا کہ وہ انسان جسے انہوں نے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ پردیس میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا وہی جب انکے مرکزوں پر قابض ہوجاتا ہے انکی قسمتوں کا مالک ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ انکی زیادتیوں کا ان سے انتقام لے ہر برائی سے درگذر کرتا ہے انہیں آزاد کر دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ انکے ساتھ ہر طرح کا سلوک کرتا ہے۔

نے رسول کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دی تھی اور جو کچھ کر سکتے تھے اس سے مطلق دریغ نہ کیا تھا۔ کیا اب انکی محنت کا پھل دوسروں کو ملیگا۔ مدتوں کی جد و جہد کے بعد انہوں نے محمد (صلعم) کو مکہ کا مالک کیا اسی لئے بنایا تھا کہ اب تک جو درجہ انکو حاصل تھا اس سے اہل مکہ کے حق میں انہیں دست بردار ہونا پڑے؟ کیا واقعی وہ حقوق رشتہ داری کو دین کی آزمودہ خدمت پر اسقدر ترجیح دیتے ہیں؟ انصار کی خفگی کی وجہ معقول تھی لیکن محمد (صلعم) نے انہیں بہت جلد راضی کر لیا۔ انہوں نے اُن لوگوں کو وہ گذرے ہوئے شاندار ایام یاد دلائے جو ایک ساتھ بسر ہوئے تھے۔ جو کچھ انہوں نے اُنکے لئے کیا تھا اور انہوں نے انکے لئے اسکا ذکر کیا اور یہ وعدہ کیا کہ اب بھی مدینہ ہی انکا وطن رہے گا اور یوں گویا وہی اسلام کا سیاسی دار السلطنت (مدینۃ الاسلام) ہوگا۔ یہ سنکر لوگ زار و قطار روئے یہانتک کہ انکی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور سب کے سب ایک ساتھ پکار اُٹھے "اے رسول خدا ہم اس تقسیم پر بالکل راضی اور اپنے حصہ پر بہت خوش ہیں"

انصار نے تو قریش کے ترجیح دئے جانے پر محض اس وجہ سے اظہار ناراضگی کیا تھا کہ وہ اپنی ترجیح چاہتے تھے لیکن اس وقت ایک طرح کا اصولی اختلاف بھی رونما ہو چکا تھا اور اسکا مطلب یہ تھا کہ بجائے دین کے نسب کیطرف توجہ کرنا اسلام سے کنارہ کشی کا مرادف ہے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خارجیوں کی ابتدا در اصل اسی وقت سے ہوتی ہے جب وادی جعرانہ میں تقسیم غنیمت کا مسئلہ پیش تھا[۵]۔ کم از کم یہ یقینی ہے کہ دنیاوی رجحان جو بہت دنوں سے اسلام میں پیدا ہو چکا تھا اُسی وقت پہلے پہل منظر عام پر آیا۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اُس فساد کا بیج جس نے آگے چلکر تمام امت کے ٹکڑے کر دئے۔ اسی

یہ دیکھنے کے بعد ان میں مخالفت کی تاب نہیں رہتی اور انکی گردنیں فوراً خم ہو جاتی ہیں۔ یہ تلوار یا دولت کی فتح نہیں بلکہ اخلاق نبوی کی فتح تھی۔ مگر مستشرقین جنکی نگاہیں روشنی میں بھی تاریکی ہی کے دیکھنے کی عادی ہیں اس عظیم الشان واقعہ میں بھی ذم کا ایک پہلو نکالے بغیر نہیں رہتے ایسی حالت میں ہم بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللھم اھد ہم انہم لا یعلمون۔ [۵] واقدی صفحہ ۳۷۷۔ ابن ہشام صفحہ ۸۸۴ (د)

موقع پر خود محمد (صلعم) کے ہاتھ سے بو یا گیا تھا وہ فساد کیا تھا؟ - ایک جنگ تھی دینی جمہوریت میں جو اسلام کا منتہائے نظر ہے اور قومی امارت میں جو در اصل عرب کے لئے مناسب و موزوں تھی یہ خود محمد (صلعم) ہی تھے جنہوں نے باگ قریش کے ہاتھ میں دیکر ابو سفیان اور انکے خاندان بنی امیہ کے لئے ملوکیت کا دروازہ کھول دیا - اگر جعرانہ میں ذو الخویصرہ خارجی نے خود رسول ہی کے خلاف کچھ کہا تو وہ جذبہ جس نے اُسے ابھارا بہت معقول تھا۔[1]

---

[1] خوارج کی ابتداء وادی جعرانہ کے واقعہ کو ٹھیرانا انکے عقائد اور انکی تاریخ سے صریح لاعلمی یا چشم پوشی پر دلالت کرتا ہے - یہ مشہور بات ہے کہ خوارج قرآن کی حاکمیت، رسول اللہ صلعم کی رسالت اور شیخین کی خلافت پر بہت شدت کے ساتھ ایمان رکھتے تھے - اختلاف جو کچھ ہے وہ اس کے بعد کا ہے - واقعہ جعرانہ سے اگر خارجیت کی ابتداء ہوئی تو اسکا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ خارجی رسول اللہ کے عدل و انصاف پر حرف رکھتے اور پھر انکی رسالت سے انکار کرتے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے دائرے سے علیحدہ ہو جاتے اور اس کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھتے اس لئے کہ اسکی ساری بنیاد تو رسول اللہ صلعم کی شخصیت پر ہی ہے - ذو الخویصرہ کے اعتراض کو معقول بتانا مضمون نگار کے سخت تعصب اور مخالفت کی کھلی دلیل ہے - یہ تعصب کی انتہا ہے کہ کسی شخص کی خوبیوں پر بھی پردہ ڈالا جائے اور اسپر اعتراض کرنے والے کا محض اس وجہ سے ساتھ دیا جائے کہ وہ اس مخصوص شخص پر اعتراض کر رہا ہے خواہ اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہ ہو لیکن غالباً مضمون نگار نے غور نہیں کیا کہ اس کی وجہ سے خود اس کے اعتراضات کا وزن بہت کم ہو گیا اور اس کی مخالفت اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہو گئی۔

بعد میں پیدا ہونے والی خرابیوں اور فساد کا بانی خود رسول اللہ صلعم کو ٹھیرا کر مضمون نگار نے اپنی جدت طبع کا ثبوت دیا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ نکتہ اس سے پہلے کسی کو نہیں سوجھا تھا اور اس اجتہاد کی داد نہ دینا تحت ظلم ہوگا مگر شاید فاضل مضمون نگار نے اس پر غور نہیں کیا کہ رسول اللہ کی تمام تعلیمات کا رجحان مساوات کی طرف ہے، اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں جن میں قبیلہ پرستی اور رنگ اور نسل کے امتیازات کے مٹانے کی

رسول کی زندگی کے آخری سال گویا محنت سے کاٹی ہوئی کھیتی کے جمع کرنے کے دن تھے۔
فتح مکہ نے دلوں پر اس قدر اثر ڈالا تھا کہ اسکا نام والفتح، پڑ گیا گویا کہ تمام دوسری فتوحات اس کے اندر گم ہو گئیں۔ ہر طرف سے قبائل کے شیوخ قبول اسلام کی گفتگو کرنے جوق جوق مدینہ میں چلے آتے تھے اور اگر کوئی فوراً حاضر نہ ہوتا تو محمد (صلعم) خود اس کے پاس آدمی بھیجتے تھے۔ مثل سابق یہ تبدیلی مذہب بھی اس وجہ سے نہیں ہوئی تھی کہ عربوں کے قلوب بدل گئے تھے۔ اپنے بتوں کو خیرباد کہنے میں انکو کوئی دقت نہ ہوئی مورتیاں اور عبادت گاہیں نہایت خاموشی سے مسمار کردی گئیں۔ بت پرستی ایک مردہ چیز تھی اور توہمات۔ سو وہ اسلام میں بھی داخل ہو سکتے تھے۔ اللہ کی حاکمیت مطلق سب پر آشکارا ہو چکی تھی اس لئے کہ کوئی قوت اس کی طاقت کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی۔ بلا خوف تردید یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ قبول اسلام کیطرف مائل کرنے والے جذبات دینی نہیں تھے بلکہ زیادہ تر سیاسی تھے[۱] اور

تاکید ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، کا پیغام لانیوالا۔ کل مومن اخوۃ کا درس دینے والا اور اسی پر یہ الزام کہ بنی امیہ کیلئے ملوکیت کا دروازہ اسی نے کھولا بجز اس کے کہ اہل نظر معترض کی عقل و خرد کا ماتم کریں اور کوئی چارہ نہیں۔ ایک چھوٹے سے جلسے، جو ایک جوشیلے نوجوان کی زبان سے نکل گیا تھا اور جس کی حقیقت کچھ بھی نہ تھی، قیاسات اور استنباط کی عمارت کھڑی کر دینا عادل اور منصف مزاج مستشرقین کا ادنےٰ کرشمہ ہے۔ رائی کا پہاڑ بنانا اسی کو کہتے ہیں۔
[۱] جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے ایک حصہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو سیاسی اغراض کیوجہ سے اسلام لائے تھے لیکن کثیر تعداد انہی لوگوں کی تھی جن کے دل میں صحیح مذہبی جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ مضمون نگار خود تسلیم کرتا ہے کہ "اللہ کی حاکمیت مطلق سب پر آشکارا ہو چکی تھی" پھر اسلام کیطرف مائل کرنیوالے جذبات دینی نہیں تھے اور کیا تھے۔ اگر مضمون نگار نے ذرا بے تعصبی سے غور کیا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اتنے دور دراز مقامات سے بھی دنود آئے تھے جہاں رسول اللہ کی تلوار کے پہنچنے میں ایک مدت صرف ہوتی اور ممکن تھا کہ فوجیں وہاں تک پہنچنے سے پہلے فنا ہو جائیں۔ خانہ بدوش عربوں کو محض طاقت سے مطیع رکھنا

اس کے معنی یہ تھے کہ لوگ توحید پر ایمان نہیں لائے بلکہ مدینہ کی سلطنت کے باجگزار بن گئے اس شہر نے جو قتدار حاصل کر لیا تھا اس نے عربوں کے لئے گویا قوت جاذبہ کا کام دیا۔ ان کی اطاعت محض خوف کیوجہ سے نہیں تھی بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں امن و انصاف کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہی احساس تھا جس نے اسلام سے پہلے کی دو صدیوں میں اُن سے بہت سی سلطنتیں قائم کرائیں۔ اب یہ بات سمجھ میں آنے لگی ہے کہ کیوں ہر طرف سے عربی سماج کے عام افراد گویا ایک طبعی احتیاج کی بنا پر مرکز جذب کی جانب جو مدینہ میں قائم تھا کھنچے چلے آتے تھے اور کیوں اُن قبائل نے بھی رسول کے سامنے گردن جھکا دی جن پر وہ براہ راست ہرگز اثر نہ ڈال سکتے تھے۔ عیسائی قبائل بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اس لئے کہ وہ پہلے عرب تھے اور پھر عیسائی۔ صرف نجران کے عیسائی اپنے دین پر قائم رہے۔ یہود ہر مقام کے اور بحرین کے مجوسی بھی نہیں ملے۔ موخرالذکر مشرک تھے اور قاعدے کے مطابق اسلامی سلطنت میں ان سے رواداری کا برتاؤ نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن عملی دشواریوں نے نظریہ کو توڑ ڈالا اور ان لوگوں کو جو اصول کے بہت پابند تھے یہ بے اصولی بھی کسی نہ کسی طرح نبھانی ہی پڑی[۱]۔

کسی طرح ممکن نہ تھا اور وہ خود بھی اپنی اس خصوصیت سے واقف تھے پھر آخر وہ کیا چیز ایسی محرک تھی جس نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی آزادی اور بے فکری کا خون کریں اور ایسے مذہب میں داخل ہوں جو انپر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اہل نظر غور کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائیگا۔ آگے چلکر خود مضمون نگار نے تسلیم کیا ہے کہ "ان قبائل نے بھی رسول کے سامنے گردن جھکا دی جن پر وہ براہ راست ہرگز اثر نہ ڈال سکتے تھے"، لیکن اسکی وجہ یہ بتاتا ہے کہ انہیں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ ذرا غور کرنیکی بات ہے کہ سیاسی بیداری تو پیدا ہو گئی تھی جو اس ترقی یافتہ عہد میں بھی بہت سی قوموں کو نصیب نہیں لیکن مذہبی بیداری نہیں پیدا ہوئی تھی جو نیم متمدن قوموں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اس الٹی منطق کا کسی کے پاس کیا جواب ہے؟

[۱] معلوم نہیں وہ کونسا قاعدہ ہے جس کے مطابق اسلامی سلطنت میں مشرکین سے رواداری کا برتاؤ نہ ہونا

اسلام کی علامات یہ بھی جاتی تھیں :- (۱) روز پنجوقتہ نماز پڑھنا یا کم از کم اوقات نماز پر موذن کا اذان دنیا (۲) زکوۃ کی ادائیگی (۳) شرع اسلامی کی پابندی جس کی تعلیم کے لئے مدینہ سے مناسب نمائندے بھیجے جاتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ حالت بالکل وہی رہی جو پہلے تھی۔ محمد (صلعم) نے اس کا بہت خیال رکھا کہ وہ قبائل کے اندرونی مسائل میں دخل نہ دیں اور جہاں جہاں ان سے ہوسکا انھوں نے موجودہ امارتوں کو تقویت پہنچانے کی کوشش بھی کی۔ تبدیلی مذہب عہد ناموں کے ذریعہ سے ہوتی تھی عوام کی کوئی بات نہ پوچھتا تھا اور تمام گفت وشنید امرا اور سردار کیا کرتے تھے اس لئے کہ درحقیقت سوال سیاسی اغراض کا تھا۔

چاہئے مسلمان تو اس سے واقف نہیں ہیں۔ ہاں کسی اور ذریعہ سے فاضل مضمون نگار کو اسکا علم ہوا ہو تو یہ دوسری بات ہو۔ کاش اس قاعدے کا حوالہ دیا گیا ہوتا کہ ہماری معلومات میں بھی کچھ اضافہ ہوتا۔

لہ اسلام کے ارکان خدا اور رسول کے حکم کی روسے تو یہ پانچ ہیں۔ ایمان باللہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوۃ اور حج۔ یہ تقسیم جو مضمون نگار نے کی ہے معلوم نہیں کہاں سے ماخوذ ہے۔ صرف پانچوقت اذان دینا کبھی نماز کی غیر موجودگی میں کافی نہیں ہوسکتا اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے کبھی کافی سمجھا گیا ہو۔ یہ خیال بھی بالکل غلط ہو کہ تبدیلی مذہب عہدناموں کے ذریعے ہوتی تھی۔ جو لوگ قریب تھے وہ فرداً فرداً رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر ارکان اسلام کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کا عہد کرتے تھے لیکن وہ لوگ جو بہت دور بستے تھے اور خود نہ آسکتے تھے اکثر اپنے نمائندے بھیجتے تھے جو حاضر ہوکر تمام جماعت کی خواہش کا اظہار کرتے تھے۔ ان نمائندوں کو حلقہ اسلام میں داخل کرلیا جاتا تھا اور بیشتر دوسروں کی تعلیم کے لئے ان کیساتھ کوئی معتبر صحابی کر دیا جاتا تھا جو کچھ دنوں وہاں قیام کرکے سب لوگوں کو لوازم اسلام کی تلقین کرتا رہتا تھا ان جگہوں پر جہاں کے لوگ خود نہیں آتے تھے رسول اللہ صلعم داعی بھیجا کرتے تھے اور ان حضرات کی کوشش سے لوگ اسلام لاتے تھے اور اس کے برکات سے بہرہ اندوز ہوتے تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امرا نے اپنے قبیلے کی طرف سے تبدیلی ارکان کی خواہش کی ہو اور رسول اللہ (صلعم) اس پر راضی ہوگئے ہوں

صرف ایک واقعہ جس کے حالات غیر معمولی تفصیل کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں مثال کے لئے کافی ہوگا۔ جنگ حنین کے بعد ہوازن محمد (صلعم) سے آن ملے تھے اور اب اپنے ہی رشتہ دار ثقیف کے خلاف جو طائف میں رہتے تھے اور اب تک بت پرست تھے جہاد کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہ لوگ ان جانوروں کو جو شہر سے باہر چراگاہوں میں ہوتے تھے پکڑ لے جایا کرتے تھے اور ان آدمیوں کو بھی گرفتار کر لیتے تھے جو کسی ضرورت سے باہر نکل آئے ہوں۔ ثقیف تنہا اور بے یار و مددگار مسلمانوں کے حملوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے اور اپنے قلعوں سے ایک قدم بھی باہر نکلنے کی انکو جرأت نہ ہوتی تھی۔ شہر کے اُمرا نے اس حالت کو ناقابل برداشت سمجھکر یہ فیصلہ کیا کہ امن حاصل کرنے کی خاطر محمد (صلعم) کی اطاعت قبول کرلیں دس نمائندے مدینہ گئے اور ثقیف کے قبول اسلام کی شرائط پر گفتگو ہوئی۔ ان سفیروں نے یہ درخواست کی کہ ان لوگوں کو زنا، سود خواری اور شراب نوشی کی اجازت دیجائے۔ محمد (صلعم) نے اس سے انکار کر دیا (سورۃ ۱۷-۳۴ و ۲-۲۷۸-۲۸۰ و ۵-۹۲) اور ان لوگوں نے بھی اپنی شرطوں کو اس وقت

جو مضمون نگار نے آگے بیان کیا ہے اگر غور کیا جائے تو اس کے دعوے کے خلاف ثبوت ہم پہنچاتا ہے۔ اگر سوال دینی اور مذہبی نہ ہوتا تو رسول اللہ اسقدر شدت کے ساتھ مراعات کرنے سے انکار کیوں کرتے۔ اہل طائف پر جو عیش و عشرت کے خوگر تھے اسلام کی پابندیاں شاق گذرتی تھیں اور اسی لئے وہ انہیں کچھ رعایت کے متمنی تھے لیکن دین کوئی تجارت تو ہے نہیں کہ اس میں لین دین ہو سکے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ اصول کے معاملے میں رسول اللہ صلعم کمزوری دکھاتے چنانچہ انہوں نے ان کی تمام درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ نمائندوں نے اہل طائف پر اصل صورت حالات جس طرح ظاہر کی وہ انکا ذاتی فعل تھا۔ رسول اللہ نے تو یہ کہا نہیں تھا کہ تم پہلے انکو دھوکا دینا۔ اس واقعہ سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ تبدیلی مذہب معاہدے کے ذریعے ہوئی یا سوال سیاسی اغراض کا تھا۔ کیا مضمون نگار کے پاس کوئی ثبوت اسکا ہے کہ اہل طائف کو ارکان اسلام کی تعلیم نہیں دی گئی یا ان لوگوں نے خود رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض نہیں حاصل کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کے دماغ پر سیاسی اغراض کا خیال اسقدر مستولی ہو گیا ہے کہ ہر واقعے میں اسے یہی جھلک نظر آتی ہے خواہ اس میں ذرا سا

واپس لے لیا جب انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ عادتیں دیکھنے میں کتنی ہی ضروری کیوں نہ معلوم ہوتی ہوں لیکن آخر دوسرے مسلمانوں نے بھی تو ان کو چھوڑ دیا ہے۔ ربۃ الطائف (لات) کے مسئلہ میں زیادہ دشواری پیش آئی۔ نمائندوں نے یہ التجا کی کہ بیوقوف عوام کا خیال کر کے انہیں اس دیوی کو تین برس تک قائم رکھنے کی اجازت دیجائے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ محمد (صلعم) اس معاملے میں بہت سخت ہیں تو وہ رفتہ رفتہ دو سال پھر ایک سال اور آخر ایک ماہ تک اُتر آئے لیکن اس سے بھی انکار کر دیا گیا۔ محمد نے صرف اس قدر رعایت منظور کی کہ ان لوگوں کو اپنے ہاتھ سے اپنی دیویں کے تباہ کرنیکا حکم نہیں دیا جائیگا وفد واپس ہوا شہر کے قریب پہنچکر عبد یالیل نے اپنے ساتھیوں کو یہ صلاح دی کہ وہ لوگ ایسی صورت بنالیں جس سے ظاہر ہو کہ بات بگڑ گئی ہے اور اس وقت اصل حقیقت کا اعلان کریں جب ثقیف میں محمد (صلعم) سے جنگ کرنیکا دم باقی نہ رہے۔ ان لوگوں کی طرح منہ چھپائے ہوئے جو کوئی اچھی خبر نہ لائے ہوں یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے اور سب سے پہلے رسم کے مطابق دیوی کی زیارت کے لئے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے قبیلہ والوں سے صلح کے شرائط بیان کئے انہیں ناقابل قبول ٹھیرایا اور محمد (صلعم) کی سختی اور غرور کی برائی کرنے لگے۔ آخر میں انہوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے یوں کہا "اب لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ، دو برس کے لئے سامان خور و نوش فراہم کر لو اس لئے کہ محمد صلعم اتنے دنوں سے زیادہ محاصرہ نہیں کر سکتے، اپنے قلعوں کی حفاظت کے لئے ایک خندق کھو دلو اور خبردار وقت کو ضائع نہ کرو" ثقیف پہلے تو اس پر تیار ہو گئے لیکن چند ہی دن کے بعد انکی ہمتیں چھوٹ گئیں اور نمائندوں سے انہوں نے کہا کہ وہ پھر جا کر انہی شرائط کو منظور کر لیں۔ اب ان لوگوں نے سچی سچی باتیں بتا دیں اور یہ کہا کہ محمد (صلعم) کے آدمی ربہ کو مسمار کرنے کے لئے آتے ہی ہوں گے۔ چنانچہ بت گرایا گیا۔ عورتیں اور بچے بہت ڈرے، اور سہمے لیکن ایک متنفس نے بھی مخالفت کے لئے ہاتھ نہ اٹھایا۔

سنہ ۱۰ھ (مطابق ۶۳۲ء) میں محمد (صلعم) نے حج کیا اس میں بھی ایک فتحیابی کی شان تھی ایران اور

شائبہ بھی اسکا نہ ہو۔ ۵ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔

یونان کے باج گذاروں کے علاوہ تمام عرب انکے قدموں کے نیچے تھا۔ انکی زندگی سب سے بڑی فتح بغیر تلوار کی خفیف حرکت کے اخلاقی قوت سے حاصل ہوئی تھی[1]۔ لیکن اب صرف عرب ان کے لئے کافی نہ تھا۔ انکے مقاصد وسیع ہو چکے تھے۔ اپنی عمر کے آخری سالوں میں انہوں نے جہاد کی باگ یونانیوں کی طرف موڑ دی۔ حدیبیہ سے واپس ہوتے ہی انہوں نے مختلف دول خارجہ کے پاس اپنے سفیر ایسے خط لیکر جن میں قبول اسلام کی دعوت دی گئی تھی، بھیجنے شروع کر دئے تھے ان سفراءمیں سے ایک بلقا، (قدیم موآب) میں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس طرح یونانیوں یا یوں کہنا چاہئے کہ عربوں کے خلاف جو یونانی سلطنت کے زیرنگیں تھے، پہلی جنگ کی بنیاد پڑی[2]۔ جو فوج اس معرکے میں بھیجی گئی اس کو بمقام موتہ بہت بری طرح پسپا ہونا پڑا (خزاں ۶۲۹ء) اور خالد بہ مشکل شکست خوردہ فوج کو جمع کر کے میدان جنگ سے نکال لانے میں کامیاب ہوئے۔ دوسرے سال موسم گرما میں ان نبطیوں نے جو مدینہ کے بازار میں آیا کرتے تھے۔ یہ افواہ اڑادی کہ شہنشاہ ہرقل مسلمانوں پر حملہ کرنیکے لئے ایک بہت بڑی فوج اکٹھا کر رہا ہے۔ محمد (صلعم) فوراً تیس ہزار کی جماعت کے ساتھ اسکے مقابلے کو چل کھڑے ہوئے لیکن تبوک سے جو قدیم ادوم کی جنوبی سرحد پر واقع تھا، آگے نہیں بڑھے اسلئے کہ یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ وہ افواہ سراسر غلط تھی۔ بہرحال یہ مہم بالکل بیکار نہیں گئی کیونکہ اس کی وجہ سے کئی چھوٹے چھوٹے یہودی اور عیسائی قبائل نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ محمد (صلعم) نے حجۃ الوداع سے واپس آکر یونانیوں کے خلاف ایک دوسرے حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور یہ فوج ہونیکے لئے بالکل تیار ہی تھی کہ وہ ۸ رجون ۶۳۲ء یوم دوشنبہ کو اس دنیا سے رحلت کر گئے

ایک ایسے انسان کے حالات کا اندازہ کرتے وقت جس نے دنیا کی تاریخ پر بے انتہا اثر ڈالا ہو

---

[1] جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک دفعہ تو مضمون نگار نے حقیقت کا اظہار کیا۔

[2] اس واقعے کے بیان کرنے کے بعد بھی نتیجہ یہی نکلا کہ یونانیوں کے خلاف فوج بھیجنے کا محرک ملک گیری کا بڑھتا ہوا جذبہ تھا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست

ہمیں گبن کا یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ "دنیا کے بڑے آدمی اور قوموں کے مذاہب کچھ نہ کچھ تنظیم کے ضرور مستحق ہیں"۔ وہ اسباب جن کی بنا پر محمد (صلعم) کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے بیشتر ان کی نجی کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ تمام عرب کی قسمت کا مالک ہوجانے کے بعد بھی بحیثیت مجموعی انہوں نے اپنی غربت اور سادگی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ کبھی زر و مال نفیس لباس یا کھانے پینے کی اچھی چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی، برابر پہلے کی طرح نہایت پابندی سے روزے رکھتے اور نماز پڑھتے رہے اور یہ بھی کسی کو دکھانے کے لئے نہیں بلکہ دل کی ایک لگن کے ساتھ لیکن کم از کم ایک بات میں تو انہوں نے نبوت کے اعلیٰ ترین اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اپنے نفس کے لئے سامان ضرور مہیا کیا، انہوں نے اپنے آپ کو ان پابندیوں سے مستثنیٰ کر لیا جو صنف نازک سے متعلق عام مسلمانوں پر عائد کی گئی تھیں، اور جیسا کہ عام طور پر سب کو معلوم ہے۔ اس استثناء سے انہوں نے بہت فائدہ بھی اٹھایا[۵۱]۔ یہ بات واقعی ایسی ہے کہ انکے خلاف ایک بہت بڑے الزام کی صورت میں پیش کیجاسکتی ہے اور بعض پرہیزگار مسلمان بھی اسے بہت برا سمجھتے ہیں۔ باایںہمہ انہیں اس سے زیادہ سختی سے جانچنا

---

۵۱ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ رسول اللہ صلعم نے باوجود قوت و اقتدار کے کبھی اپنی ذات کے لئے عیش و عشرت کے سامان نہیں مہیا کئے بلکہ ہمیشہ اسی سادگی سے زندگی بسر کرتے رہے جو ایک سچے نبی کی شایاں شان ہے اور عبادت میں بجائے کمی کے اور زیادتی ہی ہوتی رہی پھر مستشرقین کو یہ الزام رکھتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ ازواج سے متعلق آپ کو جو استثنا حاصل تھا اس کی وجہ معاذ اللہ کوئی ہوائے نفس یا ذاتی جذبہ تھا۔ وہ انسان جس کی تمام زندگی ترک الذات کا ایک بے مثل مظاہرہ ہو کس طرح اس قسم کی خواہش اپنے نفس میں رکھ سکتا ہے۔ یہ بھی خوب فرمایا کہ بعض پرہیزگار مسلمان بھی اسے بہت برا سمجھتے ہیں گویا کوئی مسلمان رسول اللہ صلعم سے بھی زیادہ پرہیزگاری کا دعوےٰ رکھ سکتا ہے۔ ہم مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ شارلیں کی شان دیکر اس نے رسول اللہ صلعم کے جرم کو ہلکا کرنیکی کوشش کی ہے۔ کاش یہ لوگ تعصب سے قطع نظر کر کے غور کرتے تو انہیں اس استثنا کی حکمت معلوم ہوتی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ)

غیر ضروری معلوم ہوتا ہے جتنی سختی سے ہم شارلیمن کو جانچتے ہیں جو فرنگی بادشاہوں میں سب سے زیادہ دیندار عیسائی سمجھا جاتا ہے۔ کچھ بھی آجکل کے معیار پر قدیم عرب کے حالات کو جانچنا ہرگز مناسب نہیں اس سے کہیں زیادہ زبردست اور تباہ کن الزام انپر یہ رکھا جاتا ہے کہ انہیں خود اپنے نبی ہونیکا یقین نہ تھا بلکہ ایک خاص غرض کے لئے انہوں نے یہ روپ بھر لیا تھا۔ انکی زندگی کے ابتدائی ایام کی بابت یہ اعتراض اب انپر کوئی نہیں کرتا بلکہ یہ عام طور پر مسلم ہو کہ ان دونوں میں انکا جوش اصلی اور حقیقی تھا۔ لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ مدینہ میں آکر اپنے اقتدار کے بڑھانیکے لئے انہوں نے نبوت کو ایک ذریعہ بنایا[۱] میرے خیال اس اعتراض کی وجہ یہ ہو کہ مذہب اور ملکی انتظام میں جدید تخیل کے مطابق تفریق کیجاتی ہو حالانکہ اسے بالکل ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ ایک نبی کے سوا اور کسی ذریعہ سے سلطنت مدینہ کی بنیاد رکھنا شاید ہی ممکن ہوتا۔ مذہب جماعت کی جان تھا۔ ایک دین کی تبلیغ اور ایک سلطنت کا قیام ان دونوں میں محض ایک خارجی ربط نہیں تھا جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ بخلاف اسکے ایک دوسرے کا قدرتی اور لازمی نتیجہ تھا۔ یہ البتہ تسلیم کیا جاسکتا ہو کہ اگر ہم واقعی کوئی نہ کوئی تفریق کرنا ہی چاہیں تو اسلام میں اجتماعی اثرات کی نسبت سے دینی معنویت بہت کم ہے۔ قرآن محمد (صلعم) کی زندگی کا کمزور ترین پہلو[۲] ہے۔ ان کی تاریخی اہمیت اور وقعت کی بنا انکا مدینے کا کام ہے نہ کہ مکہ کا۔ یہ ایک حقیقت ہو

---

[۱] اس اعتراض کا جواب دینے کی مضمون نگار نے بھی کوشش کی ہے لیکن چلتے چلتے خود بھی ایک فقرہ لکھدیا ہے کہ "اسلام میں اجتماعی اثرات کی نسبت دینی معنویت بہت کم ہے" اصل وجہ یہ ہو جیسا پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ مسیحی یورپ کے ذہن میں مذہب کی صرف وہی صورت جاگزیں ہے جس کی تبلیغ حضرت عیسیٰ نے کی اور تمام مذاہب کو وہ اسی معیار پر رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اسلام مذہبی ارتقاء کی آخری کڑی ہے اور اسمیں یہودیت اور عیسائیت کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ)

(۲) قرآن ہی تو رسول اللہ کی تعلیم کا اساس اور ان کی تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ پھر اگر اسے ہی انکی

کہ آہستہ آہستہ ان کی سیاست انکی نبوت پر غالب آتی گئی اور اکثر مواقع پر وہ ان مسائل کو سراسر دنیوی سمجھتے ایک دینی رنگ محض اسلیئے دیدیا کرتے تھے کہ وہ اور زیادہ دلفریب بن جائیں اس سلسلے میں ہمیں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے ان تمام قواعد اور احکام کو بھی جو بیشتر خود انکی فکر کا نتیجہ ہوتے تھے یا بعض اوقات دوسروں کے بتائے ہوئے بھی ہوتے تھے۔ قرآن میں بحیثیت وحی خداوندی کے جگہ دیدی ہے[۵]۔ اسی کے ساتھ ساتھ خود فریبی کا عنصر یہاں بھی مفقود نہیں ہے وہ ہر اس بات کو جو ایک سکتے کے عالم میں انکے دماغ میں آتی تھی منزل من السماء، (وحی آسمانی) سمجھ لیا کرتے تھے خواہ وہ انکے گذشتہ ذاتی خیالات کے کتنی ہی مطابق کیوں نہ ہوتی ہو یہ امر قابل معافی ہے کہ اس خیال کو ذہن میں اکیبار جاگزیں ہونیکے بعد پھر انہوں نے چھوڑا نہیں۔ جب شعلے کے بجھنے کا خوف ہوا تو وہ انگاروں کو ایک دفعہ اور ہوا دیدیتے تھے[۶]۔ اس سے زیادہ دشوار غداری اور بے رحم جذبہ انتقام کے الزام سے ان کو بری کرنا ہے جب کہ مہینہ میں نخلہ پر اچانک حملہ (جس کا انہوں نے حکم دیا تھا اگرچہ بعد

"زندگی کا کمزور ترین پہلو" تسلیم کر لیا جائے تو باقی کیا رہتا ہے؟ مکے کی زندگی ہو خواہ مدینے کا کام ان میں سے کسی کو بھی قران سے کس طرح علحدہ کیا جا سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ رسول اللہ کی مکی اور مدنی زندگیوں میں مستشرقین کو کوئی ربط نہیں نظر آتا۔ اگر مکی زندگی نہ ہوتی تو وہ تمام اصلاحات اور کام جو مدینے میں تکمیل کو پہنچے کس طرح معرض وجود میں آتے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ)

[۵] کیا احکام وحی خداوندی نہیں ہو سکتے۔ اسکے خلاف آخر کوئی دلیل بھی ہونی چاہئے۔ اس اعتراض کی وجہ وہی مذہب کا ناقص تخیل ہے جس پر تفصیلی بحث مقدمہ میں کی گئی ہے۔

[۶] یہاں سرے سے وحی والہام ہی سے انکار معلوم ہوتا ہے یا ممکن ہے دعوے یہ ہو کہ رسول اللہ پر وحی کا نزول نہیں ہوتا تھا۔ آج کل تو عام طور پر تعلیم یافتہ طبقے کا یہی خیال ہے کہ وحی والہام کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس مسئلے سے بھی مقدمہ میں بحث کی گئی ہے۔

میں انکار کر دیا) بہت سے خفیہ قتل جو انکی مرضی سے ہوئے اور جنگ خندق کے بعد چھ سو یہودیوں کا تہ تیغ کرنا یہ ایسی باتیں ہیں جن کا بار رسول کی گردن پر ہمیشہ رہے گا اور جن کی وجہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عام طور پر وہ اس قدر غیر مقبول کیوں ہیں[1]۔ لیکن اس موقع پر شار لین کی مثال جو اس سے پہلے بھی دی جا چکی ہے فراموش نہ کرنی چاہئے۔ در اصل اسی انسان کے لئے جس کے مقاصد بہت وسیع ہوتے ہیں پامال راستہ پر چلنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے[2]۔

---

[1] ان تمام اعتراضات کا الگ الگ پچھلے صفحات میں جواب دیا جا چکا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد کسی عادل اور منصف مزاج کے قلب میں تو کوئی بدگمانی رہ نہیں سکتی۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کی بات کچھ اور ہے۔ ان تمام جوابات کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔

[2] یہ بالکل صحیح ہے کہ وسیع مقاصد والے انسان کو پامال راستے پر چلنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے لیکن محتاط آدمی اور خصوصاً ایک عظیم الشان نبی سے کوئی فعل ایسا سرزد نہیں ہوتا جو قابل اعتراض ہو۔ اگر وہ پامال راستے کو چھوڑتا ہے تو محض اس لئے کہ اس سے اچھا راستہ لوگوں کو دکھلائے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نیا راستہ دکھایا ہے وہ سب سے زیادہ سیدھا ہے اور اسی دعوے کے ثابت کرنے کی ہم نے پچھلے صفحات میں کوشش کی ہے۔

فہرست

ان کتابوں کی جن سے مقدمے اور حواشی کی تیاری میں مدد لیگئی ہے یا جنکا حوالہ دیا گیا ہے:۔

عربی

۱۔ القرآن المجید

۲۔ الجامع الصحیح للبخاری

۳۔ تاریخ ابن اثیر

۴۔ تاریخ طبری

۵۔ سیرۃ النبی ابن ہشام

۶۔ اجمل الکلام فی العرب والاسلام ۔ مصطفی الدمیاطی۔

۷۔ بلوغ الارب فی مآثر العرب ۔ محمود شکری البغدادی

۸۔ العرب قبل الاسلام ۔ جرجی زیدان

۹۔ صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب ۔ نوفل آفندی ۔

۱۰۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۔ جرجی زیدان

۱۱۔ اظہار الحق ۔ مولوی رحمت اللہ

اردو

۱۔ سیرۃ النبی جلد اول و دوم و سوم ۔ مولنا شبلی نعمانی

۲۔ تحقیق الجہاد ۔ مولوی چراغ علی

۳ ۔ دین و دانش ۔ مولوی محمود علی

۴۔ اسرار شریعت جلد سوم ۔ مولوی محمد فضل خاں

۵۔ الکلام ۔ مولنا شبلی نعمانی

۶۔ رسالہ جامعہ ۔ جامعہ ملیا اسلامیہ

انگریزی

1. Encyclopedia Britannica—IX & XI Edition.
2. Encyclopedia of Islam.
3. The Spirit of Islam.— Syed Ameer Ali.
4. The Ideal Prophet—Khawaja Kamaluddin.
5. The Life of Mahomet—Sir William Muir
6. Preliminary Discourse to the translation of Koran. } George Sale.
7. An Introduction to the commentary on the holy Koran. } Abdul Haq Haqqani
8. The Koran (preface) J. M. Rode Il
9. The Koran (Introduction)—E. H. Palmer.
10. Ten Great Religions—J. F. Clarke.
11. Mohammad & Mohammadanism— Bosworth Smith
12. What is Religion—W. Bouset.
13. The Analogy of Religions—Joseph Butler
14. Forms of Religions—J. Contus.
15. Christianity and Islam—C. H. Becker.
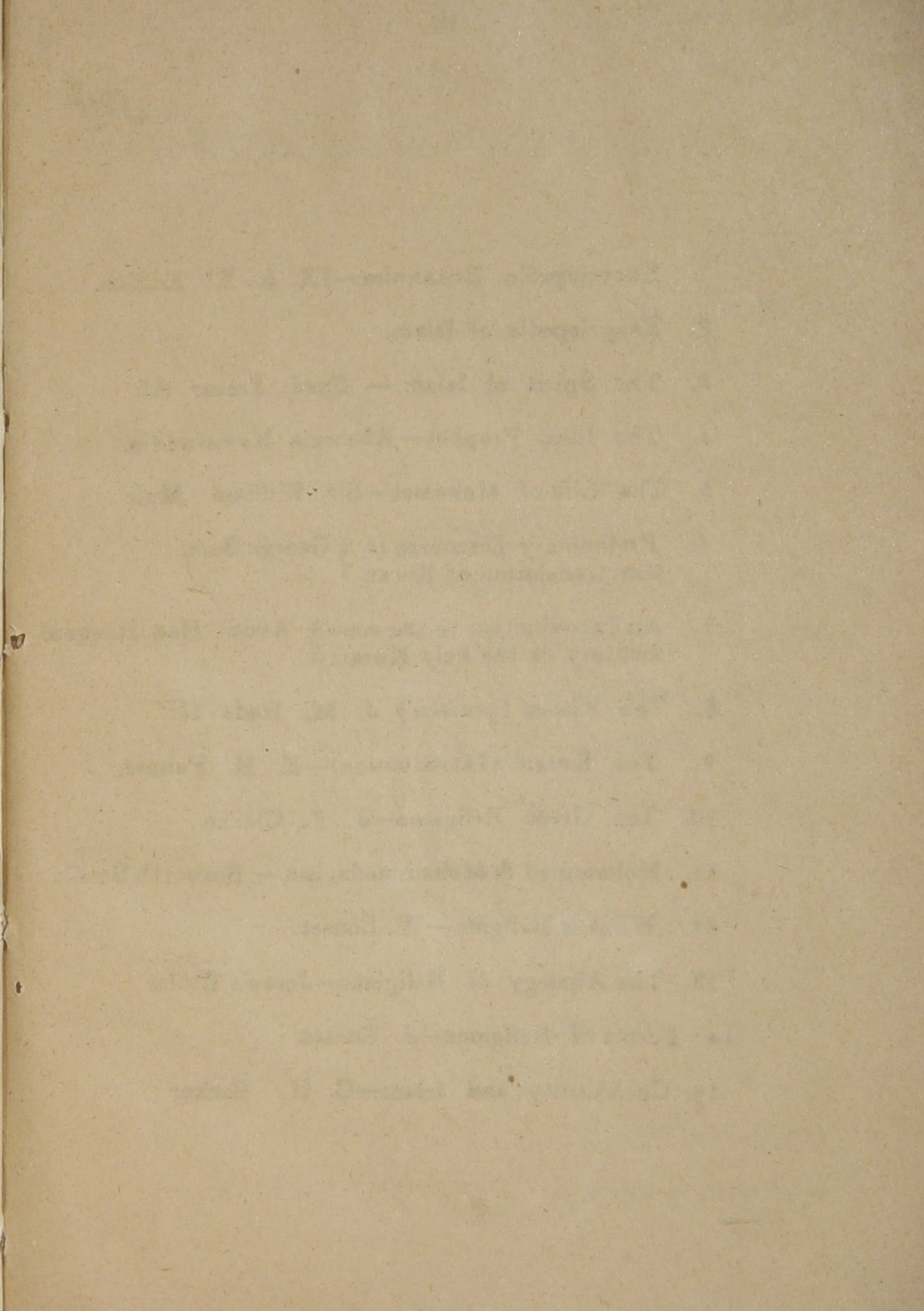
سلسلۂ سیر الصحابہؓ پر چند مستند اور اعلیٰ پایہ کتابین

خلفائے راشدین از مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی، قیمت ہے

مہاجرین، (حصۂ اول) " " قیمت للعہ

اسوۂ صحابہؓ صحابہؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی صحیح تصویر، قرون اولے کے اسلام کا عملی خاکہ اور صحابہؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارنامون کی تفصیل از مولٰنا عبد السلام ندوی، قیمت حصۂ اول و دوم (کامل) شے

سیر الانصار انصار کرام کی مستند سوانحمریان اور ان کے اخلاق اور مذہبی کارنامے، فضائل و کمالات کا سبق آموز مستند تذکرہ، از مولوی سعید صاحب انصاری، قیمت جلد اول و دوم سے

سیر الصحابیات ازواج مطہرات، بنات طیبات اور عام صحابیات کی سوانحمریان اور اُن کے علمی و اخلاقی کارنامے، از مولوی سعید انصاری صاحب قیمت عہ (ایک روپیہ آٹھ آنے)

اسوۂ صحابیات صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارنامون کا مرقع، از مولٰنا عبد السلام ندوی، قیمت عہ

سیرۃ عمر بن عبد العزیز عمرؓ ثانی حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ اموی کے سوانح حیات اور مجددانہ کارنامے، قیمت ہر

سیرۃ عائشہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوانح حیات، مناقب و فضائل اور اخلاق، علمی کارنامے اور اجتہادات، اور صنف نازک پر ان کے احسانات اسلام کے متعلق انکی نکتہ سنجیان وغیرہ وغیرہ از مولٰنا سید سلیمان ندوی، قیمت ہے

تاریخ فلسفۂ اسلام

Geschichte der Philosophie In Islam

مصنفہ T. J. De Boer

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی،

ایک جرمن تصنیف کا اردو ترجمہ

فہرست مضامین،

ضخامت کتاب ۱۵۸ صفحات، سائز ۲۰×۲۶/۸، قیمت عار